

جاسوسی دنیا نمبر 109

بھڑمے کی آواز

(مکمل ناول)

## پیش رس

”بھیڑیے کی آواز“ ملاحظہ فرمائیے۔

میں نے پچھلے کسی کتاب کے پیش رس میں غیر ملکی ایجنٹوں کی ایک حرکت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یعنی وہ افواہیں پھیلاتے ہیں۔ ایسی افواہیں جو ہمارے قومی شیرازے کو منتشر کر سکیں۔ صوبائی عصبیت کا پرچار اس کا واحد ذریعہ ہے۔ لہذا ہر ایسی افواہ کو اپنی ذات سے آگے نہ بڑھنے دیجئے جس میں صوبائی عصبیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اس پر ایک صاحب نے مجھے لکھا ہے۔ ”جہاں دو چار مل بیٹھے ہیں وہاں ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں مثال کے طور پر کوئی صاحب کوئی ایسا قصہ سناتے ہیں جس میں ایک صوبے کے فرد پر کسی دوسرے صوبے کے آدمی کی زیادتی کا ذکر ہو تو آپ اسے افواہ سازی کس طرح کہیں گے جبکہ وہ واقعہ حقیقت پر مبنی ہو۔“

ان صاحب کا خط طویل ہے لیکن یہ کلڑا خصوصیت سے جواب طلب ہونے کی بناء پر میری توجہ کا مرکز بنا۔ گزارش ہے کہ واقعہ سننے والے کو آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی یہ تو سمجھا ہی سکتا ہے کہ وہ دو صوبوں کی بجائے دو نالائق پڑوسیوں کی بات کریں۔ دو نالائق بھائیوں کی بات کریں جو وقتی غصے کے تحت ایک دوسرے کو قتل کر دینے پر بھی آمادہ ہو سکتے ہیں۔ ایک ماں کی کوکھ سے جنم لینے والوں کو میں نے آپس میں کلتے مرتے دیکھا ہے۔ آپ دو صوبوں کی بات لئے پھرتے ہیں۔ لہذا ایسے واقعات کو صوبائی رنگ دنیا دانشمندی نہیں ہو سکتی۔

ابن صفحہ

۴ جنوری ۱۹۷۱ء

## لڑکی کی غراہٹ

وہ ایک معمولی سی شام تھی۔ لیکن کیپٹن حمید کے لئے بے حد حیرت انگیز تھی۔ حیرت انگیز یوں تھی کہ اسی شام کو ایک حیرت انگیز فرض اسے سونپا گیا تھا۔ ویسے تو یہ بات بجائے خود حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ حمید جس کا سابقہ ہی حیرت انگیزیوں سے رہتا تھا اس کے لئے حیرت انگیزی کوئی معنی رکھتی ہو۔

لیکن یہ معاملہ محض اس لئے اس کی نظروں میں خاصی اہمیت رکھتا تھا کہ معضکہ خیز تھا۔ اب اسے معضکہ خیز ہی نہ کہیں گے تو پھر کیا کہیں گے کہ اس کا محکمہ شادی بیاہ اور بردکھاوے وغیرہ میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اسے کسی کا یہ شعر یاد آ رہا تھا اس وقت۔

خفیہ پولیس خانہ دل میں چھپی نہ ہو

تیر نظر چلائیں ذرا دیکھ بھال کر

ایک صاحبزادے اس کے حوالے کئے گئے تھے اور کہا گیا تھا کہ وہ بردکھاوے میں جارہے ہیں۔ اسے ان کے رفیق کی حیثیت سے ساتھ جانا پڑے گا۔ یہ حکم محکمے کے سپرنٹنڈنٹ کی طرف سے ملا تھا اور اس سے کہا گیا تھا کہ اس سلسلے میں بقیہ احکامات روائگی سے قبل ریلوے اسٹیشن پر مل جائیں گے۔

بردکھاوے میں جانے والے نوجوان کو کاغذی طور پر اس کے حوالے کیا گیا تھا۔ ابھی تک اس نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے لئے گھر پہنچا لیکن کھانے کی میز پر فریدی سے ملاقات نہ ہو سکی۔  
فریدی آج صبح ہی صبح کہیں چلا گیا تھا۔ ناشتے پر بھی اس کا ساتھ نہیں ہو سکا تھا۔  
اب اسے بقیہ احکامات کا انتظار تھا۔ کیونکہ پانچ بجے شام کو ریلوے اسٹیشن پر پہنچنا ضروری تھا۔ خالی ہاتھ نہیں بلکہ سامان سفر کے ساتھ۔

ساڑھے چار بجے تک وہ بڑی بے چینی سے فریدی کا انتظار کرتا رہا لیکن اس کی واپسی نہ ہوئی تھی نہ ہوئی۔ پھر وہ شدید ترین جھنجھلاہٹ کے عالم میں گھر سے ریلوے اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔

اسے اس کی فکر بھی نہیں تھی کہ اسٹیشن پر اس نوجوان سے ملاقات کی کیا صورت ہوگی۔  
کون تعارف کرائے گا۔ یہ تو معلوم تھا کہ نصیر آباد جانا ہوگا۔

وہ فرسٹ کلاس کے دیننگ روم میں داخل ہوا۔  
یہاں آٹھ افراد پہلے سے موجود تھے۔ وہ ایک خالی کرسی پر جا بیٹھا اور ایک ایک کانغور جائزہ لینے لگا۔ ان میں کوئی بھی بروکھاوے کے معیار پر پورا نہ اتر سکا۔ آٹھوں معمر تھے۔  
کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ ایک قوی الجشہ بوڑھا آدمی اسے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ اسکے سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید تھے۔ لیکن چہرے پر جوانوں کی سی توانائی تھی۔

کچھ دیر بعد ٹرین کی آمد کی اطلاعی گھنٹی بجی اور وہ بوڑھا آدمی حمید کو گھورتا ہوا سیدھا ہو بیٹھا۔

ٹھیک اسی وقت اس کے اپنے محکمے کا ایک آدمی دیننگ روم میں داخل ہوا۔ یہ سپرنٹنڈنٹ کا پی۔ اے تھا۔ اس نے حمید کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسی بوڑھے کی جانب اشارہ کر کے اٹنے پاؤں باہر نکل گیا۔

حمید نے طویل سانس لی۔ ہوں تو یہ بوڑھا کھوسٹ جا رہا ہے بروکھاوے میں اور اسے اس کی رفاقت کرنی پڑے گی۔

اس نے سوچا برخوردار! تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اگر اس رفاقت کی یادیں تمہیں زندگی بھر نہ تڑپائیں تو سہی! بوڑھے کے اٹھتے ہی وہ بھی اٹھ گیا..... اور پھر اس کے پیچھے ہی پیچھے دیننگ روم سے نکل کر پلیٹ فارم پر آیا تھا۔

گاڑی ابھی نہیں آئی تھی۔ بوڑھا پلیٹ فارم کی ایک بچ پر بیٹھ گیا۔

حمید ٹھلٹھا رہا۔ لیکن بوڑھے کو ایک پل کے لئے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔  
ایک جگہ اچانک سارجنٹ ریش سے مڈ بھیڑ ہو گئی اور وہ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اور ایک لفافہ تھا کر رخصت ہو گیا۔

ایک سوٹ کیس وہ خود ساتھ لایا تھا۔ پھر اس دوسرے سوٹ کیس کی کیا ضرورت تھی۔  
لفافے پر اس کا نام تحریر تھا اور رائٹنگ فریدی کی تھی۔ اس نے لفافہ جیب میں ڈال لیا اور اسی جگہ واپس آ گیا جہاں اپنا سوٹ کیس رکھا تھا۔

اتنے میں ٹرین آ پہنچی۔ بوڑھے نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور ایک ایئر کنڈیشنڈ کوپے کے سامنے آ رکا۔ پھر حمید نے اسے اس میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ جہاں تھا وہیں ٹھہرا رہا اور اب اس نے جب سے لفافہ نکال کر چاک کیا۔ تحریر فریدی ہی کی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

”سپرنٹنڈنٹ کی خواہش ہے کہ تمہیں تنہا کام کرنے کے بھی مواقع دیئے جائیں۔ اس سوٹ کیس میں میک اپ کا سامان ہے۔ خود اعتمادی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔“  
حمید نے طویل سانس لی اور خط پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور خود بھی اسی کوپے کی طرف بڑھا۔

لیکن اس کے پاس نہ تو ریزرویشن کی رسید تھی اور نہ ٹکٹ تھا۔ وہ کوپے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ سپرنٹنڈنٹ کا پی۔ اے پھر دکھائی دیا جو ٹرین کنڈیکٹر کے ساتھ اسی طرف آ رہا تھا۔  
ٹرین کنڈیکٹر نے قریب پہنچ کر حمید سے کہا۔ ”میرے ساتھ تشریف لائیے جناب۔“  
اور پھر وہ بھی اس کے ساتھ اسی تھری سیٹر کے کوپے میں داخل ہوا تھا۔ بوڑھا اپنی سیٹ پر نیم دراز نظر آیا۔

کنڈیکٹر دوسری سیٹ کی طرف اشارہ کر کے باہر چلا گیا۔ حمید نے سیٹ پر بیٹھتے وقت سر ہانے لگے ہوئے کارڈ پر نظر ڈالی تھی۔ جس پر تحریر تھا۔ ”نواب زادہ ساجد حمید۔“

اس نے بڑا سامنہ بنایا اور بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتاً بوڑھا ہنس کر بولا۔ ”میں نے آپ کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ یور ہائی نس.....!“  
”کیا مطلب.....!“ حمید کا لہجہ سخت تھا۔

”نہیں آپ کے خاندان کا پرانا نمک خوار ہوں۔ آپ کے دادا حضور ”اعتماد الدولہ“ کی خدمت میرے باپ نے کی تھی۔“  
”اعتماد الدولہ.....!“

”بس فی الحال خاموش رہئے۔ ٹرین کو چلنے دیجئے! پھر اطمینان سے گفتگو ہوگی۔ میں آپ کے والد حضور کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھ پر اس حد تک اعتماد کیا۔“  
”تعارف حاصل کرنے کا یہ ایک گھٹیا طریقہ ہے۔!“ حمید غرایا۔  
بوڑھا مسکرا کر خاموش ہو رہا۔ ویسے اس کی گفتگو نے حمید کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔  
اتنے میں ایک شعلہ جوالہ جین اور جیکٹ میں ملبوس کوپے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے قلی سامان اٹھائے ہوئے اندر آیا تھا۔

لڑکی نے اچھٹی سی نظر ان دونوں پر ڈالی اور سامنے والی برتھ پر بیٹھ گئی۔  
قلی اس کا سامان رکھ چکا تو اس نے پرس سے پانچ کا ایک نوٹ نکال کر قلی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کیپ دی چیئج.....!“  
”جی میم صاحبہ.....؟“

”باقی پیسہ تم رکھ لو.....!“ وہ جھلا کر بولی۔ ”جاہل اتنی بھی انگریزی نہیں سمجھ سکتے۔“  
”سلام میم صاحب۔“ قلی نے بڑے ادب سے اسے سلام کیا اور باہر نکل گیا۔  
تیکھے نقوش والی اس لڑکی نے حمید کو بچویشن سے بیگانہ کر دیا۔  
وہ اپنی الجھن کو پس پشت ڈال کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔  
دفعتاً بوڑھا آدمی کھاراکا اور حمید چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے وہ اسے اس دلچسپی سے باز رکھنا چاہتا ہو۔

”کیا بات ہے؟“ حمید نے بوڑھے کو انگریزی میں مخاطب کیا اور لڑکی میسانتہ ہنس پڑی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور لڑکی نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ”کیا تم اپنے جاہل نہ ہونے کا ثبوت پیش کرنا چاہتے ہو۔“

”کیا مطلب.....؟“ حمید نے بگڑے ہوئے موڈ کا مظاہرہ کیا۔

”کیا یہی بات تم اردو میں نہیں کہہ سکتے تھے۔“

”میں اجنبیوں سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتا۔“ حمید بد اخلاقی پر اتر آیا۔  
اچانک بوڑھا دخل اندازی کر بیٹھا۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ ”محترمہ براہ کرم بات نہ بڑھائیے..... پرنس کی خوش مزاجی ان کی بہتر صحت کے لئے ضروری ہے۔“

”پرنس.....!“ لڑکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اتنے میں گاڑی بھی چل پڑی۔  
لڑکی چند لمحے حمید کو عجیب نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر اس طرح جھک جھک کر حمید کو دیکھنے لگی جیسے بوڑھے کے بیان کی تصدیق کرنے کیلئے کسی خاص علامت کی تلاش میں ہو۔  
”تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔“ حمید بھنا کر اٹھتا ہوا بولا۔

”نہیں شہزادے صاحب تمہاری صحت کیلئے خوش مزاجی ضروری ہے۔“ لڑکی ہنس پڑی۔  
”محترمہ..... محترمہ.....!“ بوڑھا آدمی مضطربانہ انداز میں بولا۔

”کیا محترمہ..... محترمہ..... کر رہے ہو..... کھینچو زنجیر.....!“ حمید دھاڑا۔ ”ہم اس نامعقول ٹرین سے سفر نہیں کریں گے۔“

”ایسا بھی کیا شہزادے صاحب..... یہ اکبر اعظم کا زمانہ نہیں ہے۔“ لڑکی بدستور ہنستی رہی۔  
”خدا کے لئے محترمہ.....!“ بوڑھا گڑ گڑایا۔

”کھینچو زنجیر..... اور اتار لے جاؤ اپنے شہزادے صاحب کو۔ میں اپنے آس پاس کسی نچوڑے آدمی کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔“

”آپ کیسی نا سنجھی کی باتیں کر رہی ہیں۔“ بوڑھے نے کہا۔  
”مجھے تمہاری موجودگی پر اعتراض نہیں ہے۔“ لڑکی نے مڑ کر نرم لہجے میں کہا۔ ”صرف اپنے شہزادے صاحب کو لگج کیریر یا ڈاگ کیریر میں بند کرادو۔“

”ڈاگ کیریر میں ایسی اعلیٰ نسل کی کتیا کہاں ملے گی۔“ حمید بولا۔  
”تو تم یہیں بھونکتے رہو گے۔“ لڑکی نے بے بسی سے کہا اور اپنی برتھ پر جا بیٹھی۔  
حمید سوچ رہا تھا سفر اچھا گزرنے گا..... اس نے تمباکو کی پاؤچ نکالی اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

”تم کارڈر یا باتھ روم میں تمباکو نوشی کرو گے..... یہاں نہیں۔“ لڑکی پھر بول پڑی۔  
”بھونکتی رہو..... میں عادی ہوں اس کا۔“

”میں ابھی تمہیں یہاں سے نکلوا دوں گی۔ میرے باپ ریلوے میں سب سے بڑے آفیسر ہیں۔“

”اوہ تو کیا اس محکمے میں یتیم خانے بھی ہیں۔“

”پرنس خدا کے لئے آپ ہی خاموش رہئے۔“ بوڑھا بولا۔

”مناسب یہ ہوگا کہ تم ہم دونوں کو تنہا چھوڑ دو۔“

”بہت بہتر جناب! میں ڈانٹنگ کار میں جا رہا ہوں۔“ بوڑھے نے ہاتھ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”مم..... میں بھی چل رہی ہوں۔“

”تم چلی جاؤ گی تو پھر زنجیر کون کھینچے گا۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ بھی درست ہے۔“ بوڑھے نے پُر غفلت لہجے میں کہا۔

”کیا درست ہے؟“ لڑکی نے سوال کیا۔

”آپ بھی چلی گئیں تو پرنس تمہارا جانیں گے۔ یہ بھی ان کی صحت کے لئے مضر ہے۔“

”تو کیا میں تمہارے پرنس کے باپ کی نوکر ہوں۔“ وہ جھلا کر بولی۔

”انسانی ہمدردی محترمہ۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”آپ مجھے تنہا نہیں چھوڑ

سکتیں۔ ابھی ابھی میں نے آپ کے چہرے میں یونان کی سانپ کی جھلک دیکھی تھی۔ اب میں آپ کا احترام کروں گا۔“

”مجھے تو تم دونوں ہی فراڈ معلوم ہوتے ہو۔“

”جی نہیں! صرف میں فرہاد ہوں.....!“ حمید نے بوڑھے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ان کی

عمر اب اس قابل نہیں رہی۔“

”تم سچ سچ بہت بدتمیز ہو۔“

”محترمہ..... محترمہ.....!“ بوڑھا گڑ گڑایا۔

”میں کنڈیکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔“

”مجھ جیسے ذی عزت آدمی کو چھوڑ کر۔“ حمید نے سوال کیا۔

لیکن وہ مزید کچھ کہے بغیر بویگوں کو ملانے والے دروازے سے نکل گیا۔

”یور ہائی ٹس.....!“

”خاموش رہو..... اور بیٹھ جاؤ۔“ حمید دہاڑا۔ ”اور اب مجھے بتاؤ کہ اعتماد الدولہ کے

بیٹے کا کیا نام ہے۔“

”حضور..... حضور..... کیا آپ اپنے والد حضور کا نام نہیں جانتے۔“

”ہم اگر اتنے بے خبر نہ ہوں تو پرنس کیوں کہلائیں۔“

”نواب اقتدار الدولہ جناب۔“

”اور ہم صرف ساجد حمید ہیں..... ہم کوئی دولہ کیوں نہیں۔“

”آپ تو دولہا ہیں..... میرے حضور۔“

اس پر حمید کا ماتھا پورے طور ٹھنکا تھا۔ تو کیا..... تو کیا..... اسے یہ یقین بنایا گیا ہے۔

”بڑے میاں سچ سچ بتاؤ تم کون ہو..... درنہ اٹھا کر ٹرین سے باہر پھینک دوں گا۔“

بوڑھے کی آنکھوں میں بدمزگی کے آثار نظر آئے اور اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال

کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

کارڈ پر تحریر تھا۔ ”عبدالرؤف صدانی..... منیجر کی کارپوریشن.....!“

”پھر تم دادا کے نمک خوار کیسے ہوئے.....!“ حمید نے بھنا کر پوچھا۔

”میرے باپ ان کی سرکار میں ملازم تھے..... میں نے کچھ دنوں تک آپ کے والد

حضور کی خدمت کی ہے۔ اس کے بعد وہاں سے آب و دانہ اٹھ گیا تھا۔ پرنس لائن میں

پڑ گیا۔ میں دراصل اس کارپوریشن کا سب سے بڑا حصہ دار بھی ہوں۔“

”اپنے والد حضور کا یہ خط لہجے۔“ اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور حمید کی طرف

بڑھاتا ہوا بولا۔ ”ہم لوگ بہت ہی خاص مواقع پر یاد کئے جاتے ہیں۔“

حمید نے لفافے سے خط نکالا جس سے ایک فوٹو گراف پھلتا ہوا اس کے گم میں آگرا۔

یہ خود اسی کا فوٹو گراف تھا۔

خط میں لکھا تھا۔

”صدانی میاں!

اس یقین کے ساتھ کہ تمہیں بھی اپنے باپ کا عہد یاد ہوگا۔“

”آپ بردکھاوے کے لئے جارہے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے۔“  
 ”جب ایک لڑکی ہمیں ناپسند کر سکتی ہے تو دوسری بھی کر دے گی۔ ہم اس سلسلے میں ذرا اپنا اطمینان کر لینا چاہتے ہیں۔“  
 ”آپ مجھے الجھن میں ڈال رہے ہیں جناب عالی۔“  
 ”مسٹر صدائی!“

”آپ صرف صدائی کہہ سکتے ہیں۔ مسٹر کھلوانے کا شوق نہیں ہے مجھے۔“ صدائی کا لہجہ کسی قدر ناخوشگوار تھا۔ لیکن انداز خیر اندیشانہ ہی تھا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں خود جارہا ہوں اس کی تلاش میں۔ تم یہیں بیٹھو۔“  
 ”آپ کی مرضی.....؟“  
 حمید اٹھ گیا۔ خواہش چائے کی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈائمنگ کار تک پہنچنے کے لئے اسے دو بویگوں سے گزرنا پڑا۔

سامنے ہی میز پر لڑکی نظر آئی تھی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر اسکے مقابل بیٹھ گیا۔  
 ”یہ کیا بدتمیزی ہے۔“ وہ بھنا کر بولی۔

”میرا خیال ہے کہ میں ابھی صرف آکر بیٹھا ہوں۔ بدتمیزی میں کافی دیر لگے گی۔“  
 ”شٹ اپ.....!“

”انگریزی میں برا نہیں مانتا۔ اگر چپ بے کہتیں تو لازماً میرا ہاتھ گھوم جاتا۔“  
 ”آدی ہو یا.....!“

”پرنس ہوں۔“  
 ”شکل دیکھی ہے..... فراڈ کہیں کے۔“  
 ”کتنی بار کہو گی۔“

”تم اٹھ جاؤ یہاں سے۔“  
 ”لوگ مجھے احمق سمجھیں گے۔“

”تم تو صورت ہی سے احمق معلوم ہوتے ہو۔“  
 ”تب تو لوگ مجھے تمہارا شوہر سمجھیں گے۔“ حمید خوش ہو کر بولا۔

تمہیں یہ خط لکھا جا رہا ہے۔ ہمارے عم نامدار کی حضور ہم کو تمہارے والد لے گئے تھے۔ تم ہمارے تحت جگر کو اسکے چچا کے پاس لے جاؤ۔  
 افتخار الدین اس کا نام ہے۔ اس لئے تصویر بھی بھیجی جا رہی ہے کہ تم اسے پہچان سکو۔ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں وہ تمہیں ملے گا۔ کل شام پانچ بجے۔ آخر میں یہ دعا ہے کہ اللہ ہمارے درمیان اس روایت کو تاقیامت برقرار رکھے۔ آمین۔

دعا گو

اقتدار الدولہ

خط پڑھ کر حمید نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میرے باپ کا نام چوہدری حمید ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اقتدار الدولہ ہونے کا شرف انہیں کب حاصل ہوا۔“

”واللہ..... خوش مزاجی آپ کے خاندان کا طرہ امتیاز ہے۔“ بوڑھا صدائی ہنس کر بولا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن تم لوگوں کی وفاداری کا بھی جواب نہیں۔“

”یہی عزت افزائی ہماری جاں نثاری کا سبب رہی ہے پور ہائی نس۔“

”تو ہم دولہا ہیں۔“

”یقیناً پور ہائی نس.....!“

”لیکن ہمارے والد حضور نے تو ہمیں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا۔“

”یہ عین روایت کے مطابق ہے۔ انہیں بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ ان کے ساتھ میرے

والد گئے تھے۔“

”گئے ہوں گے۔“ حمید نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دے کر کہا۔

”مناسب یہی ہے کہ آپ بھی لاعلم ہی رہیں۔“

”لاعلمی میری جنت ہے۔“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔ چند لمحے خاموش

رہا پھر بولا۔ ”جاؤ۔ اس لڑکی کو تلاش کرو۔“

”یہ مناسب نہ ہوگا پرنس۔“

”ہماری طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے یہ بات۔“

”بکواس مت کرو۔“

”اور لوگ تمہیں جھگڑالو سمجھیں گے۔“

”تو میں ہی اٹھی جاتی ہوں۔“

”بہت زیادہ بد دماغ بیوی سمجھ کر لوگ مجھ سے ہمدردی کریں گے۔“

”خدا کرے مر جاؤ تم.....!“ وہ دانت پیس کر بولی۔

”آئندہ کسی مرد سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا اور دوسری میز پر جا بیٹھا۔

لڑکی کے چہرے پر پل بھر کے لئے حیرت کے آثار نظر آئے تھے اور پھر اس طرح معدوم ہو کر رہ گئے تھے جیسے اس میں کسی کوشش کو دخل رہا ہو۔

حمید نے ویٹر کو اشارے سے بلایا اور آہستہ سے بولا۔ ”ان صاحبہ سے پوچھو کیا پیئیں گی۔“

”میں نہیں سمجھا جناب۔“ ویٹر کا لہجہ کسی قدر ناخوشگوار تھا۔ لیکن حمید نے اس کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”زن مریدی سفر میں بھی ساتھ نہیں

چھوڑتی۔ ابھی ابھی اچانک مجھ سے خفا ہو گئی ہیں۔“

”اوہ..... میں سمجھا..... جناب..... بہت بہتر۔“ کہتا ہوا وہ لڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے بڑے ادب سے جھک کر لڑکی سے کچھ کہا تھا اور لڑکی کا چہرہ غصے سے سرخ

ہو گیا تھا۔ پھر وہ حمید کو گھورنے لگی تھی۔ اتنی سختی سے دانت بھیجنے تھے کہ جبڑوں کی وریاں ابھر

آئی تھیں۔

دفعۃ حمید نے محسوس کیا جیسے لڑکی پر غشی طاری ہو رہی ہو۔ قہر میں ڈوبی ہوئی آنکھیں

آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھیں۔

اور پھر سچ سچ اسکی گردن کرسی کی پشت گاہ پر ڈھلک گئی۔ ویٹر بوکھلا کر حمید کی طرف مڑا۔

”کک..... کوئی بات نہیں..... فکر نہ کرو۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”ان پر دورے پڑتے

ہیں اکثر۔“

اس کے قریب پہنچ کر پیشانی پر انگلی سے ٹپو کے دیئے۔ لیکن اس کی آنکھیں نہ کھلیں۔

آخر اس نے اسے ہاتھوں پر اٹھایا اور ویٹر سے کہا کہ وہ اس کا دہنی بیک اٹھالے اور اس کے

ساتھ کوپے تک چلے۔

بوڑھے صمدانی نے انہیں اس حال میں دیکھا تو بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

حمید نے اسے برتھ پر لٹاتے ہوئے ریزرویشن کارڈ پر نظر ڈالی جس پر ”خان زادی

دردانہ“ تحریر تھا۔

ویٹر کو پانچ روپے بطور بخشش دیتے وقت حمید نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا اور بوڑھے کا

آنکھ مار کر مسکرایا۔ ویٹر کے رخصت ہونے پر صمدانی نے بوکھلائے ہوئے لہجہ میں استفسار حال

کیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ غصے کی شدت کی بناء پر بیہوش ہو گئی ہے۔“ حمید نے پُرسکون لہجہ

میں جواب دیا۔

”لیکن..... لیکن جناب.....؟“

”تم فکر نہ کرو..... خود ہی ہوش میں آ جائے گی..... لیکن تم ذرا اس پر نظر رکھنا کہ زنجیر

نہ کھینچنے پائے۔“

”آپ نے بڑی دشواری میں مبتلا کر دیا ہے جناب۔“

”تم کیسے ساتھی ہو۔“

”ہمیشہ عزت کی زندگی بسر کی ہے میں نے۔ مجھ پر رحم فرمائیے۔“

اچانک خان زادی دردانہ اٹھ بیٹھی اور اس کے حلق سے عجیب قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔

لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

”بب..... بب..... بالکل ایسا معلوم ہو رہا ہے۔“ بوڑھا صمدانی کپکپاتی آواز میں

بولا۔ ”جیسے کوئی بھیڑیا غرار رہا ہو۔“

ٹیکسی ڈرائیور

لڑکی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں دردنگی تھی اور چمکدار دانت سچ سچ کسی



بھیڑی کی آواز

”بکواس..... وہ تو میرے دادا تھے۔“ لڑکی بھنا کر بولی۔ ”آخر تم لوگ میرا مذاق کیوں

اڑانا چاہتے ہو۔“

”آپ خان زادی ہیں..... اعتماد الدولہ کی اولاد نواب زادہ کہلاتی ہے۔“ صدانی جزبز

ہو کر بولا۔

”وہ میرے دادا کے بھائی تھے۔“

”نہیں.....!“ صدانی اچھل پڑا۔

”اور اسی لئے میں نے چاہا تھا کہ تم لوگ مجھ سے نہ الجھو۔ میرے باپ کو علم ہو جائے تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ خان ظفریاب.....!“

”ہوں..... تو تم میرے باپ کے نام سے بھی واقف ہو۔“

”اچھا لڑکی اب بکواس بند کرو۔“ حمید پیر بیٹج کر بولا۔ ”ہم کسی قدر غنودگی محسوس

کر رہے ہیں۔“

”اگلے اسٹیشن پر تم دونوں پولیس کی حراست میں ہو گے۔“

”اگر آپ خان ظفریاب کی صاحبزادی ہیں تو.....!“ صدانی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”اب کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ خان ظفریاب کی بیٹی اور خان دوراں کی پوتی

ہیں تو آپ کو اس کا بھی علم ہوگا کہ دونوں سلسلوں کے درمیان تعلقات کی کیا نوعیت ہے۔“

”میں پوچھتی ہوں تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“

”یہ خان دوراں کی بڑی بیٹی کے بیٹے ہیں۔“ صدانی نے حمید کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”اگر یہ سچ ہے تو.....!“ وہ حمید کو خونخوار نظروں سے گھورتی ہوئی خاموش ہو گئی۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ دارالاموت میں کیوں تشریف لائی تھیں۔“ صدانی نے

پوچھا۔

”اسی خطرہ کے امکان کا جائزہ لینے کے لئے۔“

”اسے آپ خطرہ سمجھتی ہیں۔“

بھیڑی ہی کے دانتوں سے مشابہہ نظر آنے لگے تھے۔

حمید نے جلدی سے اپنا سوٹ کیس کھولا۔ چار سو دس روپے کی دو تالی بندوق نکالی اور لڑکی کا نشانہ لے کر ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔

”یہ..... یہ..... آپ کیا کر رہے ہیں جناب عالی!“ بوڑھا صدانی بُری طرح کانپ رہا تھا۔

”خاموش رہو..... جیسے ہی یہ تم پر حملہ کرے گی میں فائر کر دوں گا۔“

پھر اچانک لڑکی پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور حمید نے صدانی کو آنکھ مار کر کہا۔ ”دیکھا تم نے۔“

لڑکی نے برتھ سے چھلاگ لگائی اور حمید کے قریب پہنچ کر بولی۔ ”ہائے کتنی ننھی سی بندوق ہے..... ذرا مجھے دکھاؤ۔“

”لو..... لو..... ضرور دیکھو.....!“

اس نے اس کے ہاتھ سے بندوق چھینی اور پھر بھڑی ہی کی طرح غراتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی۔ اس نے حمید کے دل کا نشانہ لے رکھا تھا۔

”وہ تو پہلے ہی گھائل ہے۔ یہاں کا نشانہ لو۔“ حمید نے اپنی کھوپڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

لڑکی کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انہیں کور کئے ہوئے زنجیر تک پہنچنا چاہتی ہے۔

”دو..... دیکھئے جناب۔“ صدانی ہلکایا۔

”میں دیکھ رہا ہوں۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”بندوق خالی ہے لہذا۔“

دوسرے ہی لمحہ میں اس نے نہ صرف اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی تھی بلکہ اسے اس کی برتھ پر جھٹک دیا تھا۔

برتھ پر گر کر وہ اسے بُرا بھلا کہنے لگی اور صدانی حمید کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”خدا را رحم کیجئے..... اس وقت آپ اعتماد الدولہ بہادر ہی کی طرح کلنڈرے نظر آ رہے ہیں۔“

”اعتماد الدولہ.....!“ دفعتاً لڑکی اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار تھے۔

”جی ہاں..... یہ ان کے پوتے ہیں۔“ صدانی کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔



”پھوپھی اماں بزدل تھیں۔“

”ایسا نہ کہئے۔“

وہ پھر حمید کو گھورنے لگی اور کچھ دیر بعد بولی۔ ”تو یہ بے وقوف آدمی ہمارے گھر جا رہا ہے۔ لیکن ٹھہرو..... اس گھرانے میں ساجد حمید نام کا کوئی آدمی نہیں ہے۔“

”بزدل ماں کا بزدل بیٹا۔“ وہ نفرت کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

اس بار حمید بھڑک اٹھا۔ اسے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس نے سچ مچ اس کی اپنی ماں کو کہا ہو!

”تم زبان بند کرو..... ورنہ اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔“

”بٹ اپ.....!“

حمید اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ صمدانی بیچ میں آتا ہوا بولا۔ ”آپ صبر و سکون کے ساتھ بیٹھ جائیے جناب عالی! میرا خیال ہے کہ خان ظفر یاب کی کوئی دوسری بیٹی نہیں۔“

”تم ٹھیک سمجھ بوڑھے حبیب.....!“ لڑکی آپے سے باہر ہوئی جاری تھی۔

”میں اس خاندان کا قدیم نمک خوار ہوں۔ آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔“

بوڑھے صمدانی نے مسکرا کر کہا۔

لڑکی پھر کچھ نہ بولی۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ اسے اپنی برتھ کی طرف واپس آنا پڑا تھا۔

لڑکی کی آنکھوں میں تنفر کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

بوڑھا صمدانی گھگھکیا نے لگا۔ ”خان زادی صاحبہ مجھے بے حد افسوس ہے کہ ہماری ملاقات ان حالات میں ہوئی۔ خاندانی روایت کے مطابق پرنس افتخار الدولہ اپنے چچا کی حضور باریابی کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ خان دوراں کی گزشتہ کے درو یوار شاہد ہیں کہ اعتماد الدولہ کی اولاد روایت کی پابند رہی ہے۔“

لڑکی کچھ نہ بولی۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کی بھی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

”دفعاً حمید بولا۔ ”خان دوراں..... خان ظفر یاب..... اور..... اور غالباً تمہارے

بھائی کا نام خانساں ہوگا۔“

”بٹ اپ.....! یوڈرٹی سوائمن۔“ لڑکی دہاڑی۔

”آواز بُری نہیں ہے۔“ حمید نے صمدانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں دست بستہ گزارش کروں گا۔“

”تم خاموش بیٹھو۔“ حمید نے غصیلے لہجہ میں کہا۔

”بہتر یہی ہوگا۔“ لڑکی بھی صمدانی کو گھورتی ہوئی بولی۔ ”میں اس احمق سے براہِ راست

گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔“

”یہ روایت کے خلاف ہوگا۔“

”میں لعنت بھیجتی ہوں اس روایت پر..... سمجھے۔“

”اب میں اس سلسلے میں قطعاً کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔“

”لیکن میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں پرنس کو خان ظفر یاب کی خدمت میں پیش کر کے اپنے فرض سے سبکدوش

ہو جاؤں گا۔“ صمدانی بولا۔

”اب یہ شخص زندگی بھر ان کی خدمت میں پیش نہیں ہو سکے گا۔“ لڑکی نے کہا اور اچھل

کر برتھ سے اٹھ گئی۔

وہ پھر بوگیوں کو ملانے والے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔

حمید استفہامیہ انداز میں صمدانی کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں کیا بتاؤں پرنس۔“ صمدانی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”خود میری عقل چکرا کر رہ

گئی ہے۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ دونوں ایک ساتھ سفر کریں گے۔“

”او..... چچا..... جو کچھ بھی کہنا ہے ایک ہی بار کہہ جاؤ۔ کیوں مجھے بھی مجبوظ الحواس

کر رہے ہو۔“ حمید پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔

”یہ طرزِ مخاطب آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔“

”اچھا تو میں پھر جا رہا ہوں اس کے پیچھے۔“

”اب یہ آپ کا فرض ہے کہ اپنی مگتیر کی نگہداشت خود کریں۔“

”مگتیر..... کیوں حواس باختہ ہو رہے ہو بڑے میاں۔“

”کیا تمہیں اپنے آقا اقتدار الدولہ کے بیٹے کی زندگی عزیز ہے۔“

”کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔“

”تو پھر اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤ اور وہیں سے اپنے شہر واپس چلے جانا۔“

”جی نہیں۔“ حمید بول پڑا۔ ”اب تو اپنے چچا حضور کی خدمت میں ضرور پیش کیا جاؤں گا۔“

”اس سے پہلے ہی آپ کی گردن کٹ جائے گی۔“ لڑکی بھنا کر بولی۔

اس پر حمید نے صمدانی کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی اور سوال کیا ”اب ہمیں کیا کرنا

چاہئے..... انکل صمدانی۔“

”آپ بزدل تو نہیں ہیں پرنس۔“

”میں تمہیں بزدل شمشیر حاصل کروں گا۔“ حمید نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا اور اپنے

دائیں بازو کی مچھلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”میں نے آگاہ کر دیا خطرے سے..... اب تم جانو۔“ لڑکی نے کہا اور برتھ پر نیم دراز

ہو گئی۔

صمدانی حمید کے قریب آ بیٹھا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”میں سخت الجھن میں پڑ گیا ہوں

پرنس۔ یہ نہیں ایسے حالات میں اقتدار الدولہ بہادر کیا کرتے۔“

”جاؤ..... اپنی برتھ پر جاؤ..... اس وقت تم اقتدار الدولہ کی حضور میں نہیں ہو۔ اب

تمہیں میرے احکامات کا پابند رہنا ہوگا۔“

”بجا ارشاد ہوا۔“ صمدانی نے کہا اور اٹھ کر اپنی برتھ پر جا بیٹھا۔

لڑکی نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن اس کے نچھنے پھولے ہوئے تھے اور چہرہ سرخ

تھا۔ غالباً اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔

حمید نے سوچا خاصی دلچسپی رہے گی لیکن آخر یہ ہے کیا چکر..... محکمہ سراغ رسانی کے

سپرٹنڈنٹ کو شادی بیاہ سے کیا سروکار..... نواب اقتدار الدولہ کا نام اس نے سنا تھا۔ کبھی

رہے ہوں گے نواب اب تو ایکسپورٹ اپورٹ کے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔

کچھ بھی ہو معاملہ گھمبیر معلوم ہوتا ہے۔ حمید سوچتا اور لڑکی کو گھورتا رہا۔ جو بدستور

آنکھیں بند کئے برتھ پر نیم دراز تھی۔

”آپ کی تیز مزاجی ہی کی بناء پر اقتدار الدولہ بہادر نے آپ کو اصل معاملے سے لاعلم

رکھا ہوگا۔ آپ دنیا کے کسی حصہ میں بھی پلے بڑھے ہوں لیکن آپ کی شادی اسی دستور کے

مطابق ہوگی جو سینکڑوں سال سے آپ کے خاندان میں چلا آ رہا ہے۔“

”بھلا میں دنیا کے کس حصہ میں پلا بڑھا ہوں۔“

”فرانس میں جناب عالی..... کیا..... کیا آپ مجھے اس قدر لاعلم سمجھتے ہیں۔ آپ

صرف پانچ سال کے تھے جب اقتدار الدولہ نے آپ کو ایک ہمدرد فرانسیزی کے حوالے کر دیا

تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید بولا۔

”اور آپ پچھلے مہینے تشریف لائے ہیں۔ آپ کے اعزہ آپ کو اس وقت تک نہیں

پہچان سکتے جب تک کہ انہیں آپ کی شخصیت سے آگاہ نہ کیا جائے۔“

”قدرتی بات ہے۔“ حمید نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی۔

”اب باعث تشویش یہ ہے جناب عالی کہ صاحبزادی ادھر کیوں تشریف لائی تھیں اور

پھر تنہا..... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ خان دوراں کی اولاد اتنی آزاد خیال ہو سکتی ہے۔“

”تو یہ ہمارے یہاں کیوں نہیں گئی۔“

”مجھے افسوس ہے کہ اقتدار الدولہ نے آپ کو حالات سے اس حد تک بے خبر رکھا۔“

”مجھے حالات کی پرواہ نہیں صمدانی صاحب! ہر قسم کے حالات سے پنڈنا میری ہابی ہے۔

خواہ پہلے سے ان کا علم ہو یا نہ ہو.....!“ حمید بائیں آنکھ دبا کر بولا۔

جواب میں صمدانی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دردانہ آندھی اور طوفان کی طرح کوپے میں

داخل ہوئی۔

”تو یہ حضرت میرے منگیتر ہیں۔“ وہ حمید کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔

”ڈانٹنگ کار کا ویئر بھی سخت نامعقول واقع ہوا ہے۔ وہ تو تمہیں میری بیوی سمجھا تھا۔“

حمید بولا۔

”تم خاموش رہو۔ میں ان سے گفتگو کر رہی ہوں۔“ لڑکی نے صمدانی کی طرف اشارہ کیا۔

”مناسب یہی ہوگا محترمہ۔“ صمدانی نے کہا..... اس بار اس کا لہجہ سرد تھا۔

”بکواس.....!“

”مادام پوندری میر کہلاتی ہیں..... ان کے شوہر میر طارق علی اردو کے ایک بلند پایہ ادیب ہیں۔ اپنی اردو کے لئے میں انہی کا رہین منت ہوں۔ مادام پوندری میر اکثر کہا کرتی ہیں کہ شوہر کی وجہ سے ان کی مادری زبان چوہٹ ہو گئی ہے اور وہ فرانسیسی بولنے وقت ”نوج..... ادنی اللہ..... اور ہائے میں مر گئی“ وغیرہ کہنے لگی ہیں۔“

”لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر نظر آئی تھی جس کا گلا اس نے فوری طور پر اگھونٹ دیا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔“ میں تمہیں پھر سمجھاتی ہوں کہ ہماری گڑھی میں قدم بھی نہ رکھنا۔“

”اگر چچا حضور اس قسم کی کوئی پابندی لگائیں تو سر آنکھوں پر۔“

”اچھی بات ہے..... خود جھگٹو گے..... یہ زمانہ بندوق جو ساتھ لئے پھرتے ہو کام نہ آئے گی۔ میں نے قہری ناٹ تھری پر نشانے کی مشق کی ہے۔“

”ارے..... وہ چار سو دس بور تو میں لڑکیوں کو خوش کرنے کے لئے ساتھ رکھتا ہوں۔ اتنی چھوٹی سی بندوق دیکھ کر وہ بے قابو ہو جاتی ہیں۔“

”ہونہہ.....!“ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ ”ہمارے اسلحہ خانے میں بھانت بھانت کی بندوقیں اور رائفلیں ہیں۔“

”میں توپ سے بھی نہیں ڈرتا۔ تم سے شادی کر کے رہوں گا۔“

”بکواس بند۔ میں اس سلسلے میں اب اور کچھ نہیں سننا چاہتی۔“

حمید باپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے لڑکی کی باتوں سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوا ہو۔

کچھ دیر بعد اس نے باپ کا کش لے کر کہا۔ ”اقتدار الدولہ بہادر مجھے گولی مار دیں گے اگر میں چچا ظفریاب کی حضور پیشی سے پہلے ہی بھاگ نکلا۔“

”تم ابا حضور تک نہیں پہنچ سکو گے۔ ان تک پہنچ جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ میری شکست ہو گئی۔“

”کیا میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔“

دفعۃ حمید نے صدائی کو اشارہ کیا کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔

اس نے بالکل مشینی طور پر اس کے اس حکم کی تعمیل کی تھی۔ اتنی آہستگی سے دوسری طرف چلا گیا کہ لڑکی کو علم نہ ہو سکا۔

”محترمہ.....!“ کچھ دیر بعد حمید نے اسے آواز دی اور وہ آنکھیں کھول کر سیدھی ہو بیٹھی۔

”کیا بات ہے؟“ وہ غرائی۔

”گزارش ہے کہ مجھے روایات سے نفرت ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں اس قدیم خاندانی روایت کو توڑ دوں گا۔“

”سچ سچ.....!“ دفعۃ لڑکی کا چہرہ کھل اٹھا۔

”ہاں..... لیکن تمہیں دیکھ لینے کے بعد میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اگر اب میں نے اس روایت کو توڑ دیا تو مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی خوبصورت ہو گی۔“

”شٹ اپ.....!“

”بُرا نہیں ماننا..... فرانس کی بیویاں اپنے شوہروں کی پٹائی تک کر دیتی ہیں..... اور میں اسی ماحول میں پلا بڑھا ہوں۔“

”اس خیال کو دل سے نکال دو کہ مجھے حاصل کر سکو گے۔ لاشیں گر جائیں گی۔“

”کیا کوئی جن عاشق ہو گیا ہے تم پر.....!“

”میں کہتی ہوں بکواس بند کرو..... تم کوئی فراڈ ہو..... جس کی زندگی بچپن سے اب تک فرانس میں گزری ہو وہ اتنی با محاورہ اردو نہیں بول سکتا۔“

”یہ ناممکن نہیں ہے دردانہ بیگم..... میں جرمنوں کے سے لہجے میں جرمن بول سکتا ہوں اور فرانسیسیوں کی طرح فرانسیسی۔“

”اُردو کا ماحول وہاں تمہیں کیسے ملا ہوگا۔“

”وہ خاتون جو میری اتالیق تھیں ان کا سسرالی سلسلہ نسب لکھنؤ کے ایک میر صاحب سے ملتا تھا۔“

”نوابزادہ ساجد حمید..... یہ ناممکن ہے۔“ لڑکی نے تلخ لہجے میں کہا۔

”بات بڑھانے کی ضرورت نہیں پرنس۔ وہی کیجئے جو صاحبزادی کہہ رہی ہیں۔“

صدائی بول پڑا۔

”ہوں ٹھیک ہے۔“ حمید نے کہا اور سختی سے ہونٹ بھیج لئے۔

ٹرین کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی۔ لڑکی اپنا سامان اکٹھا کرنے لگی۔ صدائی اپنے اور حمید کے سامان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

”دوسری بات۔“ دفعتاً لڑکی ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”اگر کوئی بھی ریسیو کرنے آئے تو ایسے بن جانا جیسے ہم ایک دوسرے کے لئے قطعی اجنبی ہوں۔ اس سے ہرگز نہ کہنا کہ تمہیں بھی دورانِ نگر جانا ہے اور تم لوگ کون ہو۔“

”بہت بہتر محترمہ۔“ صدائی نے بڑے ادب سے کہا۔

ٹرین رک گئی۔ وہ نیچے اترے۔ دردانہ کو ریسیو کرنے کئی آدمی آئے تھے۔ صدائی حمید سمیت الگ جا کھڑا ہوا۔

دردانہ ان لوگوں سے کچھ کہہ رہی تھی جو اسے لینے آئے تھے۔ پھر حمید نے انہیں دیننگ روم کی طرف جاتے دیکھا۔

”اب کیا خیال ہے جناب صدائی صاحب۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر پوچھا۔

”اب ہمیں باہر چلنا چاہئے جناب عالی..... دورانِ نگر یہاں سے پندرہ میل کے فاصلے

پر ہے۔ ٹیکسیاں اور بسیں چلتی ہیں۔“

”رات اتنی خوشگوار ہے کہ ہم اونٹ گاڑی پر سفر کرنا پسند کریں گے۔“

”اونٹ گاڑیاں تو یہاں نہیں ہوتیں جناب۔“

”لہذا پیدل.....!“

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں جناب..... مم..... مطلب یہ کہ پندرہ میل۔“

”ایسی خوبصورت لڑکی کے لئے ہم پندرہ ہزار میل بھی پیدل چل سکتے ہیں۔“

”لل..... لیکن میں بوڑھا آدمی ہوں جناب!“

”کیا تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے۔“

”میں اب تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔“

”تم اتنی اچھی ہو کہ تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا۔“

”تو پھر.....؟“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔“

”اگر تم سنجیدگی سے سنو تو میں اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

”ضرور کہہ..... میں سنوں گا۔“

”تم اب حضور کے سامنے پہنچ کر انکار کر سکتے ہو۔ کہہ سکتے ہو کہ تم فرانسیسی لڑکی

شادی کر دو گے۔ دیسی لڑکیوں سے تمہارا عہدہ نہیں ہو سکے گا۔“

”تدبیر تو ٹھیک ہے..... لیکن یقین کرو اے میری بنت عم..... تم پر سے درجنو

فرانسیسی لڑکیاں ٹارکی جاسکتی ہیں۔“

اس بار اس نے حمید کو بناوٹی غصے سے گھورا تھا۔ لیکن کچھ بولی نہیں تھی۔ گاڑی کے با

اندھیرا پھیل چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد صدائی واپس آ گیا اور اس نے دونوں ہی پر تحیرانہ نظریں ڈالیں کیونکہ

وہ اپنی اپنی برتھ پر سکون سے نیم دراز تھے۔ لڑکی انگریزی کا کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی اور ج

پاپ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔

نصیر آباد کے اسٹیشن پر اترتا تھا۔

رات کے نو بج رہے تھے اور دس منٹ بعد وہ نصیر آباد پہنچنے والے تھے۔ دفعتاً لڑکی

حمید کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میں اسٹیشن پر رک کر ریل کار کا انتظار کروں گی۔ جس ڈاکٹر!۔

لئے دارالحکومت گئی تھی وہ میرے بعد ریل کار سے روانہ ہوا ہوگا۔“

”ڈاکٹر..... کیوں!“

”ابا حضور کے لئے..... وہ علیل ہیں۔“

”تو کیا ہم بھی ٹھہریں گے تمہارے ساتھ۔“

”ہرگز نہیں..... تم دورانِ نگر جاؤ گے۔ اسٹیشن پر باہر ٹیکسیاں موجود ہوں گی۔“

”لیکن ہم تو تمہارے ساتھ ہی جانا چاہتے ہیں۔“

## دوسری غراہٹ

”کک..... کیوں آپ مجھ بوڑھے کا مذاق اڑا رہے ہیں۔“

”محبت کے بغیر ہی پہاڑی زندگی گزار آئے ہو۔“

”پرنس مجھ پر رحم کیجئے۔“

”اگر پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا تو اب ٹرائی کرو۔“

”واقعی آپ مجھ بوڑھے کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔ لیکن یقین کیجئے کہ اقتدار الدولہ بہادر

اسے پسند نہیں فرمائیں گے۔ وہ بزرگوں کا ادب کرتے ہیں خواہ وہ انکے خادم ہی کیوں نہ ہوں۔“

اس بار صدائی کا لہجہ کسی قدر ناخوشگوار ہو گیا تھا۔ اس نے جھک کر اپنا سوٹ کیس اٹھایا

اور دوسرا ہاتھ حمید کے سوٹ کیس کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ حمید نے کہا۔ ”اس حد تک بوڑھوں

کا لحاظ ضرور کرتا ہوں کہ انہیں زیادہ وزن نہ اٹھانے دوں۔“

اس نے خود ہی اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور دونوں گیٹ کی طرف بڑھے۔

باہر متعدد ٹیکسیاں موجود تھیں اور ٹیکسی ڈرائیور بالکل تانگے والوں کے سے انداز میں

آوازیں لگا رہے تھے۔

حمید نے دیکھا کہ کئی ڈرائیور ان کی طرف جھپٹے ہیں اور جیسے ہی وہ قریب آئے اس

کے ہاتھ پیر پھول گئے اور اس لیے تونگے ڈرائیور پر اس کی نظر جم گئی۔ جو دونوں ہاتھ بڑھا کر

ان دونوں سے سوٹ کیس لے رہا تھا۔

”دو..... درواں نگر..... حج جائیں گے۔“ حمید ہکھلایا۔

”بہت بہتر جناب..... میری گاڑی آرام دہ ثابت ہوگی۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا

اور وہ دونوں اس کے پیچھے چل پڑے۔ اس نے ڈیگی میں ان کے سوٹ کیس رکھ دیئے اور

چھیلی نشست کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

حمید گرتا پڑتا ٹیکسی میں داخل ہوا تھا۔ صدائی ڈرائیور کے برابر اگلی سیٹ پر جا بیٹھا۔

گاڑی چل پڑی اور حمید اپنی پیشانی کا پسینہ خشک کرنے لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی پشت پر

اس کی نظر جمی ہوئی تھی۔ کیونکہ ڈرائیور کی وردی میں یہ کرنل فریدی تھا۔ میک اپ کے بغیر۔

حمید کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے فریدی کو میک اپ کے بغیر کسی پیشہ ور ٹیکسی

ڈرائیور کے روپ میں دیکھا۔

حالات کچھ بھی رہے ہوں لیکن وہ کوئی اہم معاملہ ہی ہو سکتا تھا جس کی بناء پر فریدی

نے اپنے طریق کار میں کسی حد تک تبدیلی کی تھی۔

حمید عجیب سی گھٹن میں مبتلا ہو گیا۔ صدائی کی موجودگی شدت سے کھل رہی تھی۔ پتہ نہیں

وہ کون تھا اس کی موجودگی میں فریدی سے گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔

دخترا اس نے صدائی سے پوچھتے سنا۔ ”درواں نگر میں کہاں تشریف لے جائیں گے جناب۔“

”قصر درواں.....!“

”ادہو.....!“

اس کے بعد اس نے پھر کچھ نہیں پوچھا تھا۔

قصر درواں ایک قلعہ نما عمارت ثابت ہوئی جس کے عظیم الشان پھانک پر دو مسلح سنتری

پہرہ دے رہے تھے۔ جیسے ہی ٹیکسی پھانک کے قریب پہنچی ایک سنتری رائفیل سپرہی کر کے

اس کی طرف مڑا۔ ٹیکسی اس سے پہلے ہی رک چکی تھی۔ سنتری قریب آیا۔

”کون.....؟“ اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔

”ہم خان کے مہمان ہیں۔“ صدائی نے جواب دیا۔

”ڈاکٹر.....!“

”نہیں مہمان.....!“

”ہمیں کسی مہمان سے متعلق اطلاع نہیں دی گئی۔“

”خان علییل ہیں..... ہم ان کی عیادت کو آئے ہیں۔“

”ڈراٹھہریئے.....!“ سنتری نے کہا اور پھانک کی طرف مڑ گیا۔ پھر وہ اپنے ساتھی

سے کچھ کہتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔

صمدانی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا یہ انتظام۔“

”کیسا انتظام.....؟“ حمید نے پوچھا۔

”خان ظفر یاب کی ڈیوڑھی میں لفظ مہمان خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ملازمین بحث نہیں

کرتے تھے۔ مہمان کو خاموشی سے مہمان خانے تک پہنچا دیا جاتا تھا۔“

”کس صدی کی بات کر رہے ہیں جناب۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”پندرہ بیس سال پہلے کی بات ہے جناب۔“

”تب کوئی جوان لڑکی گھر میں نہ رہی ہوگی..... کم از کم فرانس میں تو ایسا نہیں ہوتا۔“

”مجھے تو اب اجازت دیں جناب۔“ فریدی نے صمدانی سے کہا۔ ”ٹیکسی اندر نہیں

جاسکے گی۔ ان کی اپنی گاڑی آپ کو یہاں سے لے جائے گی۔“

”میاں ایسی بھی کیا جلدی۔“ صمدانی بولا۔ ”کم از کم اندر سے جواب تو آ جانے دو۔“

”صاحب میں معافی چاہتا ہوں..... گئی بار پہرہ داروں سے تکرار ہو چکی ہے۔“

”اچھی بات ہے بھائی۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا اور جیب سے پرس نکال کر میز پر رکھ دیا۔

ریڈنگ کی اور کرایہ فریدی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

ڈگی سے ان کا سوٹ کیس نکالتے وقت فریدی نے ایک چھوٹا سا پیکٹ حمید کے ہاتھ

میں تھما دیا تھا۔ حمید نے چپ چاپ اسے جیب میں ڈال لیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس اٹھائے پھانک کے سامنے کھڑے تھے اور

ٹیکسی جا چکی تھی۔

”اب مجھے شدت سے بھوک لگ رہی ہے..... جناب صمدانی صاحب۔“ حمید بڑبڑایا۔

”میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا پرس۔“

”کیا حالات دگرگوں ہیں۔“

”خدا جانے..... میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔“

دفعۃً وہ سنتری آتا دکھائی دیا جو اندر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔

سنتری پھانک پر ہی رک گیا اور دوسرا آدمی سچے تلے قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف بڑھ

چلا آیا۔

”کہئے جناب۔“ اس نے سوال کیا۔

”ہم خان کی عیادت کو آئے ہیں..... اور ہمیں اقتدار الدولہ بہادر نے بھیجا ہے۔“

”اوہ.....!“ وہ آدمی غالباً پس و پیش میں پڑ گیا تھا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اس

نے کہا۔ ”آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ابھی حاضر ہوا۔“

وہ تیزی سے مڑا اور پھانک سے گزر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

”لا حول ولا قوۃ.....!“ حمید بھنا کر بولا۔ ”کم از کم فرانس میں تو ایسا نہیں ہوتا؟“

”یہاں بھی نہیں ہوتا تھا جناب۔“

”تو پھر کیا یہ ہمارے قدموں کی برکت ہے۔“ حمید نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

”قطعی بے دست و پا ہوں جناب۔“

”بے سرو پا باتیں نہ کرو..... یہ بتاؤ کہ میں کون سا دولہ ہوں۔“

”ابھی آپ صرف افتخار الدین ہیں۔ اقتدار الدولہ بہادر کے بعد آپ افتخار الدولہ

کہلائیں گے۔“

”مزید لا حول ولا قوۃ۔“

”اب آپ تو جی نہ جلائیے۔“

”خبردار جو ایسی باتیں کیں..... تم ہی تو مجھے یہاں لائے ہو۔“

”جناب جناب..... خدا را مجھے مزید پریشان نہ کیجئے۔“

”لیکن میری بھوک۔“

”کسی بیوہ ماں کی طرح جھنجھلا کر اس وقت یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کھا لیجئے۔“

حمید کو ہنسی آ گئی اور صمدانی تقدیر کا شکوہ کرنے لگا۔

اتنے میں ایک چھوٹی سی کار اندر سے آتی دکھائی دی۔

وہ ان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ ایک خونخوار شکل کا آدمی اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ وہ انہیں گھورتا ہوا غرایا۔ وہ خود گاڑی سے نہیں اُترا تھا۔

حمید گواہ کا انداز جارحانہ لگا لیکن وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول چپ چاپ اندر بیٹھ گیا۔

لیکن جب صمدانی اگلی سیٹ پر ڈرائیو کے قریب بیٹھنے لگا تو اس نے غرا کر کہا۔ ”تم بھی



”یچھے جاؤ۔“

”میں اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

”کیوں.....؟“

لیکن قبل اس کے کہ صدائی اس ”کیوں؟“ کا جواب دیتا حمید نے تحکمانہ لہجے میں کہا  
”تم میرے پاس آ جاؤ۔“

”بب..... بہت بہتر جناب۔“ صدائی ہکلاتا ہوا پچھلی سیٹ پر آ بیٹھا۔

گاڑی فرائے بھرتی ہوئی پھانک سے گزرتی چلی گئی۔

واقعی حمید کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی قلعے میں داخل ہوا ہو۔

\* چاروں طرف عمارتوں اور باغات کے سلسلے بکھرے ہوئے تھے۔ گاڑی جس سڑک  
جاری تھی بہت سلیقے سے بنائی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پانی پر تیر رہی ہو۔

جلد ہی اس سفر کا خاتمہ ہوا۔ گاڑی ایک چھوٹی سی خوبصورت عمارت کے سامنے رک گئی۔  
تھی۔ ڈرائیور نے عمارت کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”مہمان خانہ۔“

حمید اس انداز گفتگو کا مطلب بخوبی سمجھتا تھا۔ اس نے صدائی سے اتر چلنے کو کہا۔

”سخت تو ہیں کی جارہی ہے۔“ صدائی کا لہجہ غصیلا تھا۔

وہ دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس سنبھالے ہوئے نیچے اتر گئے۔

”ٹھہرو.....!“ ڈرائیور غرایا ”یہ کارڈ لیتے جاؤ۔“

صدائی نے مڑ کر کارڈ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا تھا۔

پھر حمید نے اس سے لے کر دیکھا۔ جلی حروف میں اس پر تحریر تھا۔

”مہمان۔ دعا گوئے، دولت و اقبال۔“

”حد ہوگئی۔“ صدائی پیر پٹخ کر بولا۔

گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ حمید نے صدائی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”دماغ ٹھنڈا رکھو۔“

اس کے بعد وہ عمارت کی طرف بڑھے تھے۔ صدر دروازے پر انہیں روک کر کا

دیکھا گیا۔ صدائی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کا ڈ دیکھنے والے نے انہیں

اند پر پہنچایا۔ کمرہ بہت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ یہاں دو بستر تھے۔

”آپ دونوں کو اسی کمرے میں قیام کرنا پڑے گا۔ کیونکہ دوسرے کمرے پہلے سے  
گھرے ہوئے ہیں۔“ ہمراہی نے ان سے کہا۔

”اندازاً کتنے مہمان ہوں گے۔“ حمید نے سوال کیا۔

”آپ کو اس سے کیا سروکار.....!“ اس کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ حمید نے معذرت کی۔

”کیا آپ لوگ کھانا کھا چکے ہیں؟“

”نہیں.....!“

”اچھا تو پھر دس منٹ بعد آپ کو ڈائننگ روم میں پہنچا دیا جائے گا۔“

”بہت بہتر جناب عالی!“ حمید نے بڑے ادب سے کہا۔

جب وہ آدی چلا گیا تو صدائی غصیلے لہجے میں بولا۔ ”آپ کو اپنے رتبے کا خیال رکھنا چاہئے۔“

”پیٹ بھر لینے کے بعد اپنے رتبے کے متعلق سوچوں گا۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا

اور صدائی ٹھنڈی سانس لے کر مغوم لہجے میں بولا۔ ”کاش آپ کی تربیت خود اقتدار الدولہ

بہادر کے زیر نگرانی ہوئی ہوتی۔“

”بس خاموش رہو..... ورنہ سچ تمہیں ہی کھا جاؤں گا۔“

دس منٹ بعد ایک بادردی بیر انہیں ڈائننگ روم میں لے گیا تھا۔

کھانے کے دوران میں حمید محسوس کرتا رہا کہ صدائی زبردستی حلق سے نوالے اُتار رہا ہے۔

خود اس نے خوب ڈٹ کر معدے کی تواضع کی اور پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے ویٹر

سے سوال کیا۔ ”کیا کھانے کے بعد کافی نہیں پیش کی جاتی۔“

”اگر کوئی مہمان فرمائش کرے تو ضرور پیش کی جاتی ہے جناب۔“

”تم بہت شائستہ آدمی ہو..... تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”خدمت ہی مسلک ہے۔“ ویٹر نے کسی قدر جھک کر کہا۔

”ہم کھانے کے بعد کافی پینے کے عادی ہیں۔“

”ابھی پیش کی جاتی ہے جناب۔“ ویٹر نے کہا اور برتن سمیٹ کر چلا گیا۔



بھیڑے کی آواز

”غالباً اقتدار الدولہ بہادر کو پہلے ہی شبہ تھا کہ کہیں آپ انکار نہ کر دیں۔“ صمدانی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”اگر میرا مشورہ شامل حال ہوتا تو آپ کبھی فرانس نہ جاسکتے۔ آپ کی تعلیم و تربیت یہیں ہوتی۔“

”مجھے الجھن میں نہ ڈالو پیارے صمدانی..... بتاؤ کہ کس قسم کے حالات سے میرا سابقہ ہے۔ لائسنس میں کہیں کوئی ٹھوکرا نہ کھاؤں۔“

”مناسب ہے..... ضروری بھی ہے کہ آپ کو حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔“

”اور اب تم اسی طرح آرام سے لیٹ جاؤ جیسے پہلے لیٹے ہوئے تھے۔ حفظ مراتب کا خیال ترک کر دو، ورنہ دونوں ہی تکلیف اٹھائیں گے۔“

”بہت بہت شکریہ جناب! بڑھاپا بڑی چیز ہے۔“ صمدانی نے کہا اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر بولا۔ ”اعتماد الدولہ اور خان دوراں جڑواں بھائی تھے۔ دونوں کے درمیان بے انتہا محبت تھی۔ ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ یہ قلعہ ان کی آبائی جائے رہائش تھی۔ اس زمانے میں اعتماد الدولہ صرف اعتماد الدین تھے اور خان دوراں عباد الدین کہلاتے تھے۔ اس وقت ان دونوں کے باپ خان دوراں کہلاتے تھے۔ کیونکہ یہ خاندانی خطاب شیر شاہ سوری کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ دونوں بھائیوں کو شکار کا بے حد شوق تھا۔ خصوصیت سے بھیڑیوں کا شکار ان کی مرغوب ترین تفریح تھی۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے اور ان کے پیچھے بے شمار شکاری کتے شور مچاتے ہوئے چلتے۔ میں نے اپنے باپ سے سنا تھا کہ دوسری جاگیروں میں یہ دونوں دو دیوانوں کے نام سے مشہور تھے۔ لڑکے کے لوگ ان کے نام سے کانپتے تھے۔ بہر حال اس چپقلش کی کہانی بھیڑیے کے شکار ہی سے شروع ہوئی ہے۔ ایک بار یہ دونوں جھنڈ سے پھڑے ہوئے ایک بھیڑیے کے تعاقب میں تھے، جوان کے کئی کتوں کو زخمی کر چکا تھا۔ اعتماد الدولہ کا کہنا تھا کہ اسے کتوں ہی سے زیر کرایا جائے اور خان دوراں کو ضد تھی کہ جیسے ہی وہ نظر پڑا وہ اسے راقفل کا نشانہ بنادیں گے۔ بات اتنی بڑھی کہ دونوں نے ایک دوسرے پر راقفلیں تان لیں کوئی بچ بچاؤ کرانے والا بھی نہیں تھا۔ اسی دوران میں بھیڑیا بھی جھاڑیوں میں نظر آ گیا اور ان دوراں نے اپنی راقفل کا رخ اس کی

”آپ ان بدبختوں کو منہ نہ لگائیے جناب۔“ صمدانی نے بہت بُرا سامنہ بنا کر کہا۔

”ارے اب تم میری فکر نہ کرو۔ میں عوامی زندگی گزارنے کا عادی ہوں۔ میری تربیت جاگیردارانہ ماحول میں نہیں ہوئی۔“

”اب پھر سے آپ کی تربیت کرنی پڑے گی..... ورنہ.....!“

”پلیز صمدانی..... بس..... مجھے بورنہ کرو۔“

دفعۃً وینٹرنے آ کر اطلاع دی کہ تھوڑی دیر بعد کافی بیڈ روم ہی میں سرورکزی جائے گی۔ وہ بیڈ روم میں واپس آ گئے اور حمید نے ہاتھ روم کی راہ لی۔ اب اسے اس پیکٹ کا دھیان آیا تھا جو چلتے وقت فریدی نے صمدانی سے چھپا کر اس کے حوالے کیا تھا۔

ہاتھ روم میں پہنچ کر اس نے پیکٹ نکالا اور اسے کھولنے لگا۔

”اوہ.....!“ اس نے طویل سانس لی۔ یہ ایک چھوٹا سا جیبی ٹرانسمیٹر تھا۔ شکل سگریٹ لائٹر کی تھی اس کے ساتھ ہی ایک تحریر بھی تھی۔

”تم جس وقت چاہو اس ٹرانسمیٹر پر مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو..... اور بہتر یہی ہوگا کہ خود ہی کرید کرید کر اس بوڑھے آدمی سے ان حالات سے متعلق معلومات حاصل کرو جس سے اس وقت دوچار ہو۔“

حمید نے اس پرچے کو نذر آتش کر دینے کے بعد ٹرانسمیٹر کو جیب میں ڈال لیا اور بیڈ روم میں واپس آ گیا۔

صمدانی آنکھیں بند کئے آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ حمید کی آہٹ پر چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

حمید بستر پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”ہم چچا حضور کی خدمت میں کب پیش کئے جائیں گے۔“

”کیا عرض کروں جناب! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا..... ان حالات کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔“

”صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے..... ابا حضور نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ مجھ سے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ فرسٹ کلاس وینٹن روم میں ایک آدمی مجھے ملے گا جس کے ساتھ مجھے سفر کرنا ہے۔“

طرف کر کے فار کر دیا۔ گولی نشانے پر بیٹھی تھی۔ اعتماد الدولہ نے خان درواں پر فار کر دیا۔ گولی اتفاقاً گھوڑے کے سر پر لگی۔ اس طرح خان درواں نے اپنا بچاؤ کر لیا۔ دونوں نے جھاڑیوں میں پوزیشن لے لی تھی اور اس وقت تک ایک دوسرے پر فار کرتے رہے تھے جب تک کارتوس ختم نہیں ہو گئے تھے۔

اس کے بعد شاید دونوں ہی کو ہوش آیا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے منہ چھپائے ہوئے جنگلوں میں بھٹکتے پھرے تھے۔ اعتماد الدولہ نے پھر کبھی اس گڑھی کی صورت نہ دیکھی، جو آج قصر درواں کہلاتی ہے۔ وہ کافی عرصہ تک ادھر ادھر بھٹکتے رہنے کے بعد ایک بڑی ریاست میں جا پہنچے تھے۔ وہاں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک بڑے عہدے پر فار ہوئے اور باپ کی زندگی ہی میں خطاب یافتہ ہو گئے۔ اعتماد الدولہ کہلائے۔ یہ اس ریاست کا سب سے بڑا اعزاز تھا اور صرف شاہی خاندان کے افراد ہی تک محدود تھا۔ ان دونوں کے باپ خان درواں نے اپنی زندگی میں بڑی کوشش کی تھی کہ دونوں بھائی مل جائیں لیکن اعتماد الدولہ نے تو انہیں بھی شکل دکھانے سے انکار کر دیا تھا۔ معذرت طلب کی تھی۔ خان درواں یعنی ان کے باپ نے ان کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنے اس مطالبے کو دہرائے۔ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگائی تھی کہ خواہ دونوں بھائی زندگی بھر ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھیں لیکن وہ اپنے بچوں کی شادیاں آپس ہی میں کریں گے۔ باہر اسی صورت میں کر سکیں گے جب دونوں بھائیوں کی اولاد میں جوڑ نہ ملے۔ لہذا تمہارے والد اقتدار الدولہ کی شادی تمہارے چچا، جو باپ کے مرنے کے بعد خان درواں کہلائے تھے ان کی بیٹی سے ہوئی۔ تمہارے دادا کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے خان ظفر یاب کی شادی خاندان سے باہر ہوئی تھی۔ اب یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تم اپنے باپ کی واحد اولاد ہو اور خان ظفر یاب کے بھی صرف ایک ہی بیٹی ہے۔“

صدائی خاموش ہو گیا اور حمید پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ اتنے میں کسی نے باہر سے دروازے پر دستک دی۔

”آ جاؤ۔“ حمید نے بلند آواز میں کہا اور ویر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

جب وہ کافی کی ٹرے رکھ کر واپس جانے لگا تو حمید نے اسے دس کا ایک نوٹ دیتے

ہوئے کہا۔ ”تم بہت باسلیقہ آدمی ہو۔“

”شکریہ جناب۔“ اس نے نوٹ وصول کر کے حمید کو تعظیم دی اور باہر چلا گیا۔

”اور اب.....!“ صدائی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں اسی لئے تمہیں یہاں لایا ہوں کہ تمہاری شادی ظفر یاب کی بیٹی سے ہو سکے۔ مجھے معاف کرنا میں تمہیں تم کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جاگیردارانہ نظام والی تہذیب کو تہہ کر رکھو، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”ہوں..... اوں..... لیکن کیا تم اس بد تمیز لڑکی سے نباہ کر سکو گے۔“

”بد تمیزوں کو باتمیز بنانا میری ہوتی ہے۔ ٹھہرو..... تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود تمہارے لئے کافی بناؤں گا۔“

”بہت بہت شکریہ..... میں بہت تھک گیا ہوں پرنس! اور یہاں کے لوگوں کے اطوار نے میرے اعصاب پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔“

”فکر نہ کرو..... ہر تکلیف کا ازالہ ہو جائے گا۔“ حمید نے کہا اور اٹھ کر کافی بنانے لگا۔

صدائی نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”کاش میں کسی ذریعہ سے اقتدار الدولہ

بہادر کو یہاں کے حالات سے آگاہ کر سکتا! میں نہیں چاہتا کہ مجھ پر کسی قسم کا الزام آئے۔“

”میں کہتا ہوں ہر اندیشے کو اپنے ذہن سے جھٹک دو۔ پورے حالات کا علم ہو جانے کے بعد سب کچھ مجھے کرنا ہے۔“

”تو پھر میں بری الذمہ۔“

”قطعاً.....!“ حمید نے کافی کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم کافی پی کر سونے کی کوشش کرو۔“

اس کے بعد پھر کسی قسم کی گفتگو نہیں ہوئی تھی اور کافی ختم کر کے صدائی بستر پر جا لیٹا تھا۔ قریباً دس منٹ بعد حمید نے اس کے خرائے سے۔

وہ فریدی سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بے چین تھا۔ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے

بعد کہ صدائی بے خبر سو رہا ہے وہ پھر باتھ روم میں داخل ہوا اور عقبی کھڑکی کھول کر ایسی پوزیشن

”ہے تو بھائی..... لیکن میرے ساتھی کے پاس ہے اور وہ بے خبر سو رہا ہے۔“  
”تب تو مجھے افسوس ہے جناب۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔ مہمان پر اس قسم کی پابندی آج تک نہ دیکھی نہ سنی۔“  
”آپ، براہ کرم اندر تشریف لے جائیے۔“ دربان نے سخت لہجہ میں کہا۔ صورت سے اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔

”اچھا میرے مہربان دوست۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔  
کمرے میں پہنچ کر دس منٹ بعد ٹرانسمیٹر پر فریدی سے رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

آخر تھک ہار کر اس نے لباس تبدیل کیا اور سونے کیلئے لیٹ گیا تھا۔ دن بھر کی تھکن غنودگی کی گود میں جالیٹی لیکن نیند کے غلبے سے قبل ہی کسی نے باہر سے دروازے پر دستک دی۔  
وہ اٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دروازے کو گھورتا رہا۔ پھر اونچی آواز میں پوچھا۔  
”کون ہے؟“

جواب میں غراہٹ سنائی دی۔ یقیناً وہ کسی خونخوار بھیڑیے کی غراہٹ تھی۔

## باپ اور بیٹا

غراہٹ ہی کے ساتھ لوگوں کی چیخیں بھی سنائی دینے لگیں۔ شور اتنا بڑھا کہ صدائی کی نیند بھی اُچٹ گئی۔

حمید کو نہایت آرام سے آرام کرسی پر نیم دراز دیکھ کر بولا۔ ”آپ نے شاید یہ بھی معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ معاملہ کیا ہے۔“

”کچھ بھی ہو ہمارے آرام میں خلل پڑا ہے..... ہم ان نالائقوں کو ہرگز معاف نہ کر سکیں گے۔“

میں آ گیا کہ باہر سے دیکھا نہ جاسکے۔ پھر جب سے ٹرانسمیٹر نکال کر اس کا سوچ آن کیا اور ہلکی آواز میں فریدی کو پکارنے لگا۔

”ہیلو..... ہارڈ اسٹون..... ہارڈ اسٹون.....!“  
”اٹ از ہارڈ اسٹون.....!“

”میں نے بوڑھے سے ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق ہمارے ساتھ یہاں سرد مہری کا برتاؤ ہوا ہے۔ اس مہمان خانے میں ہمیں جگہ ملی ہے جہاں دولت و اقبال کے دعا گو ٹھہرائے جاتے ہیں..... اور.....!“

”صبر سے کام لو..... تمہارے لئے دلچسپیاں ہوں گی..... اور.....“  
اس کے بعد حمید نے اسے بتایا کہ کس طرح اتفاقاً لڑکی سے ٹرین ہی میں ملاقات ہو گئی تھی۔

”اچھی علامت ہے.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ویسے وہ ابھی تک ریلوے اسٹیشن ہی پر ریل کار کی منتظر ہے۔ اگر تم اسی وقت خان تک پہنچنا چاہتے ہو تو باہر نکلو اور مہمان خانے سے بائیں جانب چل پڑو۔ قریباً دو سو قدم کے فاصلے پر دائیں جانب ایک اور راستہ ملے گا جس کا اختتام ایک چھوٹے سے پارک پر ہوا ہے۔ پارک کے پھانک پر جو آدمی ملے اس سے اتنا کہہ دینا کہ تم مہمان ہو..... وہ تمہارے لئے کوئی تدبیر کر دے گا۔ ذرا ٹھہرو..... ہاں..... تم آدھے گھنٹے بعد وہاں سے روانہ ہو سکتے ہو..... اور.....!“

”کیا میرا ہونے والا خسر بہت زیادہ بیمار ہے..... اور.....!“  
”خفقان کا مریض ہے..... وہ لوگ اسے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ تم اگر کسی طرح اس تک پہنچ سکو تو بہتر ہے..... اور اینڈ آل.....!“

دوسری طرف سے آواز آئی بند ہو گئی اور حمید نے طویل سانس لیکر سوچ آف کر دیا۔  
کمرے میں واپس آ کر اس نے لباس تبدیل کیا اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد مہمان خانے سے نکل ہی رہا تھا کہ دربان نے اُسے ٹوکا۔

”پیٹ میں کچھ گرانی سی محسوس کر رہا ہوں اسلئے کچھ دیر ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔“ حمید بولا۔

”کیا آپ کے پاس رات کو باہر نکلنے کا اجازت نامہ ہے۔“

”میں گزارش کر رہا ہوں کہ باہر نکل کر دیکھئے تو کیا معاملہ ہے۔“  
 ”آپ خود ہی تکلیف فرمائیے۔“ حمید نے زہریلے لہجے میں کہا۔  
 ”اللہ میرے بڑھاپے پر رحم کرے۔“

حمید نے سوٹ کیس سے چار سو دس یورپی ڈنالی بندوق نکالی اور کارتوسوں کی پٹی گلے میں ڈال کر دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ پھر کسی نے دروازہ پیٹا۔  
 اب نہ بھیڑیئے کی غراہٹ سنائی دی تھی اور نہ کوئی چیخ۔

”کون ہے؟“ حمید نے دروازے کے قریب پہنچ کر اونچی آواز میں پوچھا۔  
 ”دروازہ کھولئے جناب۔“ باہر سے سہمی ہوئی سی آواز آئی۔ یہ اسی شریف النفس ویر کی آواز تھی جسے حمید نے دس روپے ٹپ کئے تھے۔

اس نے جلدی سے بندوق سلیپنگ پا جائے میں اڑس کر اوپر سے قمیض چھوڑ دی اور کارتوسوں کی پٹی پلنگ کے نیچے ڈال کر دروازہ کھولا۔

ویر بولکھلائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوا اور خود ہی اس طرح دروازہ بند کرنے لگا جیسے ملک الموت تعاقب میں ہو۔ پھر مڑ کر ہکھلایا۔ ”آپ..... ل..... لوگ بخیریت ہیں نا۔“  
 ”بیٹھ جاؤ۔“ حمید نے اس کا بازو پکڑ کر آرام کرسی پر بیٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت

زیادہ پریشان معلوم ہوتے ہو۔ ذرا دم لے لو۔“

ویر بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔ حمید کھڑا رہا۔ بندوق کی وجہ سے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔  
 ”کیا قصہ تھا۔“ صدائی نے ویر کو مخاطب کیا۔

”خاموش رہو..... اسے دم لینے دو۔“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔

دو تین منٹ تک گہری خاموشی رہی پھر ویر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اس مہمان خانے پر پہلی بار اس کا حملہ ہوا تھا۔ میرے خدا کتنا بھیاںک تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار بھیڑیا دیکھا۔“

”بھیڑیا.....!“ حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔  
 ”جناب عالی! کیا آپ نے آواز نہیں سنی تھی۔“  
 ”میں سمجھا تھا شاید کوئی لڑکی ہے۔“

”لڑکی.....!“ ویر کی خوفزدگی حیرت میں تبدیل ہو گئی۔

”ہاں ہاں..... ہماری طرف لڑکیاں اس طرح غراتی ہیں۔“

”آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں جناب۔“

”پہاڑوں کے دیس سے جہاں کی لڑکیاں بھیڑیوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔“

”وہ بھیڑیا ہی تھا جناب۔“ منحوس بھیڑیا۔ جو ایک سو سال سے اس خاندان پر مسلط ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

لیکن ویر حمید کے سوال کا جواب دینے کی بجائے خود کلامی میں مبتلا نظر آیا۔

”لیکن اس نے مہمان خانے کا رخ کیوں کیا..... وہ تو صرف محل سرا میں دیکھا جاتا تھا۔“

”میرے دوست تم مجھے الجھن میں مبتلا کر رہے ہو۔“

”جی.....!“ ویر چونک پڑا۔

”پردیسوں سے ادھوری باتیں نہیں کی جاتیں۔“

”صاحب یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“

”کچھ بھی ہو میں ضرور سنوں گا۔“

اور پھر ویر نے اعتماد الدولہ اور خان دوراں کی کہانی شروع کر دی۔

حمید باپ کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا۔ وہ اب بھی اسی جگہ کھڑا تھا۔

وہ کہانی ختم کر چکا تو صدائی نے کہا۔ ”میں نے پہلے تو کبھی یہ نہیں سنا کہ قصر دوراں میں

کوئی بھیڑیا دکھائی دیا ہو۔“

”پچھلے سال تک یہ بات ڈھکی چھپی رہی تھی جناب! لیکن جب محل کے باہر کا ایک

آدمی اس کا شکار ہوا تو سب کو معلوم ہو گیا۔“

”ہوں..... تو تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ وہی بھیڑیا ہے جسے خان دوراں نے گولی ماری

تھی۔“ حمید نے پوچھا۔

”صرف میرا نہیں سب کا یہی خیال ہے جناب..... ویسے محل سرا والے اس کی تردید

ہی کرتے رہتے ہیں۔“

”خیر ہوگا..... یہ بتاؤ یہاں بھیڑیئے نے کس کو زخمی تو نہیں کیا۔“

”بس باورچی بال بال بچ گیا۔ وہ باورچی خانے کی کھڑکی میں سے اندر داخل ہوا تھا اور ادھر ہی سے بھاگ بھی گیا۔“  
”چلو..... میں دیکھوں گا۔“

”نہیں جناب۔ مجھے یہیں رہنے دیجئے جب تک محل سرا سے کوئی یہاں نہ پہنچ جائے۔“  
فون کیا گیا ہے۔“  
”اوہو..... کیا یہاں فون بھی موجود ہے۔“

”اس چھوٹے سے قلعے میں کیا نہیں ہے جناب! خان نے اسے ایک چھوٹا سا شہر بنا دیا ہے۔“

حمید نے پھر کوئی سوال نہ کیا۔ انہیں وہیں چھوڑ کر ہاتھ روم میں داخل ہوا اور بندوق کا سیٹکس کی الماری میں چھپا دی۔

رات کے دو بجے تھے۔ اس نے سوچا ضروری نہیں کہ اس وقت بھی ٹرانسمیٹر کے ذریعہ فریدی سے رابطہ قائم کیا جاسکے۔ وہ پھر کمرے میں واپس آ گیا اور اب اس فکر میں تھا کہ ویٹر کی نظر بچا کر کسی طرح کارتوسوں کی پٹی بھی سمہری کے نیچے سے نکال لے۔  
دفعتاً کسی پولیس کار کے سائرن کی آواز سنائی دی۔

”کک..... کیا یہاں پولیس بھی ہے۔“ صدانی نے ویٹر سے پوچھا۔  
”خان کی اسٹیش پولیس جس کے سربراہ ان کے بھیجے سردار ضیغم ہیں۔“  
”خان کے بھیجے۔“ صدانی اچھل پڑا۔ ”لہل..... لیکن انکے تو کوئی دوسرا بھائی نہیں ہے۔“  
”بیوی کے بھیجے کو آپ کیا کہیں گے۔ جناب سردار ضیغم خود ہی تشریف لائے ہوں گے۔ وہ خود ہی ہر معاملے کو دیکھتے ہیں۔ اب مجھے باہر نکلتا چاہئے۔“

”ضرور..... ضرور.....!“ حمید بستر سے اٹھتا ہوا بولا۔ اس نے ویٹر کو باہر نکال کر دروازہ بولٹ کر دیا۔

ہاتھ روم سے بندوق لا کر کارتوسوں کی پٹی سمیت سوٹ کیس میں رکھ دی اور ایش ٹرے میں پائپ کی راکھ جھاڑ کر لیٹ گیا۔

”پتہ نہیں ہم کس مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔“ صدانی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”لیٹ جاؤ..... لیٹ جاؤ..... دیکھا جائے گا۔“ حمید نے کہا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

پھر شاید قریباً دس منٹ بعد کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔  
”کون ہے.....؟“ حمید جھلا کر پوچھا۔  
”دروازہ کھولو۔“ گونج دار آواز اور سخت لہجے میں کہا گیا۔

حمید نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک قد آور نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر چیتے کی کھال کے سے کپڑے کی قمیض اور سیاہ پتلون تھی۔ بھاری جبرے سفاک طبیعت کی غمازی کر رہے تھے۔ آنکھوں میں سرنخی کے ساتھ ساتھ وحشت بھی تھی۔  
اس کے پیچھے دو مسلح آدمی کھڑے تھے۔

”تم لوگ کہاں سے آئے ہو۔“ اس نے حمید کو گھورتے ہوئے پوچھا۔  
”دارالحکومت سے۔“

”کیوں آئے ہو.....؟“

”بتاؤ.....!“ حمید نے صدانی کو لالکارا۔

صدانی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے آیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہمیں اقتدار الدولہ بہادر نے بھیجا ہے۔“

”اوہو..... اچھا.....!“

”یہ پرنس افتخار ہیں۔“

”اوہ..... ہیلو.....!“ اس نے آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے حمید سے مصافحہ کیا۔

یقیناً وہ خاصا طاقتور آدمی تھا۔ حمید نے محسوس کیا۔

”لیکن..... آپ لوگ یہاں کیسے..... کیا آپ نے افسر مہانداری کو نہیں بتایا تھا کہ آپ کون ہیں؟“

”یہ تو نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا کہا تھا کہ ہمیں اقتدار الدولہ بہادر نے خان کی عیادت کو بھیجا ہے۔“

”تب تو اس بیچارے کا کوئی قصور نہیں..... اب آپ دونوں حضرات براہ کرم میرے

ساتھ چلے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے شایان شان استقبال نہ ہو سکا۔  
”کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں۔“ حمید نے کہا اب وہ خالص فرانسیسی انداز میں  
اردو بول رہا تھا۔

دونوں مسلح آدمیوں نے ان کا سامان اٹھایا اور وہاں سے چل پڑے۔

”چچا حضور کی اب کیسی طبیعت ہے۔“ حمید نے سردار ضیغم سے پوچھا۔

”اس وقت ایک ڈاکٹر دارالحکومت سے آیا ہے۔ صبح ہی معلوم ہو سکے گا کہ اب کیسی  
طبیعت ہے۔ وہ ڈاکٹر کے علاوہ اور کسی کو اپنے کمرے میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ دیکھ  
بھال کے لئے تین نرسیں ہیں اور دو فیملی ڈاکٹر۔“

”مرض کیا ہے جناب۔“ صدائی نے پوچھا۔

”ابھی تک مرض کی تشخیص نہیں ہو سکی۔“

وہ کار میں بیٹھ گئے جسے ضیغم ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ دونوں مسلح آدمی وہیں رہ گئے۔

حمید ضیغم کے برابر اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

”آخر یہ کیسا ہنگامہ تھا موسیوزیگم.....!“ اس نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

”کہیں سے ایک بھیڑیا آ گیا ہے۔“

”بھیڑیا کیا.....؟“

”وولف..... وولف..... میں نہیں جانتا کہ اسے فرانسیسی میں کیا کہتے ہیں۔“

”وولف میں سمجھتا ہوں..... بائی گاد..... میں اس کا شکار کروں گا۔“

”اوہ..... شکاری بھی ہیں آپ۔“

”ہاں..... مجھ کو شکار کا شوق ہے۔“

”آپ اردو قریب قریب خاصی بول سکتے ہیں۔“

”ہاں..... میری گورنس کامیاں لکھنوی تھیں۔“

”بہت خوب.....!“

گاڑی اب ایک بڑی عمارت کے سامنے رکی تھی۔

”یہ خصوصی مہمان خانہ ہے..... معززین کے لئے۔“ سردار ضیغم نے کہا۔

”بہت بہت شکر یہ جناب عالی!“ صدائی گڑبڑایا۔ ”مجھے جناب والا کی خوش اخلاقی نے  
بے حد متاثر کیا ہے۔“

”میں اس نمک خوار کا بیٹا ہوں جو اقتدار الدولہ بہادر کو خان دوراں کی خدمت میں  
پیش کرنے کے لئے لایا۔“

”اوہ..... اچھا اچھا.....!“ سردار ضیغم نے پرمعنی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔

”مگر یہ بھیڑیا جناب عالی!“

”آپ لوگ فی الحال اندر چلے۔ یہ ہمارا درد سر ہے۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔ عنقریب  
اسے ختم کر دیا جائے گا۔“

”مجھے نہ بھولنے کا موسیو۔ اس کے شکار پر مجھے بھی ساتھ لے چلے گا۔“

”ضرور..... ضرور.....!“ لہجہ طنزیہ تھا۔

وہ اندر آئے اور اس بار وہیں کے دربان نے ان کے سوٹ کیس اٹھائے تھے۔

”کیا یہاں اور بھی مہمان ہیں۔“ حمید نے سردار ضیغم سے پوچھا۔

”نہیں.....!“

”تب تو ہم وہیں بہتر تھے۔ یہاں تنہائی میں.....!“

”آپ کی تنہائی رفع کر دی جائے گی۔“ خان ضیغم نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے

ہوئے کہا۔ ”اب مجھے اجازت دیجئے۔ صبح ملاقات ہوگی۔“

سردار ضیغم کے چلے جانے کے بعد صدائی نے کہا۔ ”یہ جگہ معقول معلوم ہوتی ہے۔ لیکن

جناب عالی..... مجھ پر ایک کرم فرمائیں۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”ہم دونوں ایک ہی کمرے میں سوئیں گے۔“

”کیوں.....؟“

”ایسے حالات میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”آخر بھیڑیا ہی کیوں؟ شہ، چتا، مار پھینک نہیں۔ ان اطراف کے جنگلوں میں ان



کی بھی کمی نہیں۔“

حمید نے اس پر مزید بات نہیں بڑھائی تھی اور وہ ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔  
دوسری صبح بھاری بھر کم ناشتے سے سابقہ پڑا۔ یہاں کے ملازمین ان کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔

قریباً دس بجے سردار ضیغم پھر دکھائی دیا۔ پر تپاک انداز میں حمید سے ملا اور بولا۔ ”عجیب بات ہے کہ پھوپھی حضور اور بے بی خان آپ لوگوں سے ملنے پر رضامند نہیں۔“  
”خدا را آپ اپنا تعارف بھی تو کرائیے۔“ صدائی نے کہا۔

”میں خان ظفر یاب کا بھتیجا سردار ضیغم ہوں۔“

”مطلب یہ کہ چچی حضور کے بھتیجے۔“ حمید نے پوچھا۔

”جی ہاں.....!“

”میں چچا حضور سے ملنے آیا ہوں۔“

”ان پر تین بجے شب سے غشی طاری ہے۔“

”ہوش میں آنے کا انتظار کیا جائے گا۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”یہاں مہمانوں سے یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ اب تشریف لے جائیں۔ جب تک آپ

لوگوں کا دل چاہے قیام کیجئے۔“

”اوہ..... اچھا.....!“ حمید نے بڑے فکری لہجے میں کہا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”یہ

بے بی کان کون ہیں۔“

اس پر ضیغم نے قہقہہ لگایا اور حمید کو آنکھ مار کر صدائی کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا۔

”ہم نہیں سمجھتے جناب عالی!“

”جن کے لئے آپ چچا حضور کی خدمت میں پیش ہونے آئے ہیں۔ ان کا نام دردانہ

ہے لیکن محل میں بے بی خان کہلاتی ہیں۔“

”اور وہ مجھ سے نہیں ملیں گی۔“ حمید نے بے بسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”ان کا خیال تو یہی ہے۔“

”آپ اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“

”بھلا میں ان لوگوں کو کس طرح آمادہ کر سکوں گا۔“

”کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں..... لیکن وہ بھیڑیے کا شکار۔“

”اس میں آپ ضرور شریک ہوں گے۔“

”بس کافی ہے۔“

”اچھی بات ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ کچھ دیر بعد آپ کی تنہائی رفع ہو جائے

گی۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا دیجئے۔“

”نہیں کچھ نہیں..... شکریہ۔“

وہ چلا گیا اور صدائی بے حال ہو کر آرام کرسی پر گر گیا۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے بھائی..... شادی میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں۔“ حمید نے اس کے

شانے پر تھپکی دے کر کہا۔

”اس سے بڑی تو ہین اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ بہو بیگم آپ سے ملنے سے انکار کر دیں۔“

”یہ بہو بیگم کیا چیز ہے۔“

”آپ کی چچی حضور.....!“

”میں چچا حضور سے ملنے آیا ہوں۔“

”یہ لوگ ہرگز نہیں ملنے دیں گے..... میں سمجھ گیا۔ صاحبزادی کو ماں کی حمایت حاصل

ہے۔ پرنس یہ بہت بُرا ہوا۔ بہت بُرا۔“

”فرانس میں میری تین چار محبوبائیں ہیں..... تم بالکل فکر نہ کرو۔“

”آپ نہیں سمجھ سکتے ان معاملات کو۔“

”میں صرف ایک ہی معاملہ سمجھتا ہوں۔ شادی کے سلسلے میں بس خاموشی..... میں کچھ

دیر تمہارا ہٹا چاہتا ہوں۔ کسی دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔“

صدائی کو کمرے سے نکال کر اس نے دروازہ بند کیا اور عقبی باغ کی طرف کھلنے والی

کھڑکی کے قریب پہنچ کر جیب سے ٹرانسمیٹر نکالا۔ فریدی سے فوری طور پر رابطہ قائم ہوا تھا۔

حمید نے اسے پچھلی رات سے لے کر اب تک کی داستان سنائی اور بولا۔ ”اس بار تو

بالکل ہی اندھے کنوئیں میں دھکیل دنا ہے..... اور.....!“



”ہاں ماموزیل.....!“

”اللہ..... کتنا پیارا.....!“

حمید مسکراتا رہا۔ وہ باہر نکلے۔ روش پر سرخ رنگ کی اسپورٹ کار نظر آئی۔

”آپ ڈرائیو کریں گے۔“ لڑکی نے ہنس کر پوچھا۔

”ماموزیل کی مرضی۔“

”میرا نام رخصی ہے۔“

”رکشی..... بہت پیارا نام ہے۔“

”ہائے رکشی کہہ کر تو آپ نے اسے اور بھی پیارا کر دیا۔“

حمید نے انکیشن کی اس سنے لے کر انجن اسٹارٹ کیا۔ وہ اس کے قریب بیٹھی پکے آم کی طرح مہک رہی تھی۔ حمید نے ذہن میں یہی تشبیہ آئی۔ ورنہ اس نے تو ایوڈی کولون میں خود کو بسا رکھا تھا۔

جیسے ہی کار پھانک سے نکلنے لگی ایک دوسری لمبی سی کار نے اس کا راستہ روک لیا جس پر ایک جغادری قسم کا بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے حمید کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ خود اس کی گاڑی بھی رک گئی تھی۔ ڈرائیور نے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بڑے ٹھسے سے نیچے اترتا تھا۔ عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ لیکن قوی مضبوط تھے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجیب سی مکارانہ چمک تھی۔

اسپورٹ کار کے قریب پہنچ کر اس نے غرائی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ ”تم اقتدار کے بیٹے ہو۔“

”ہاں میں اکتدار الدولہ کا بیٹا ہوں اور ان کے بعد اقتدار الدولہ کہلاؤں گا۔“

”تم خصوصی اجازت نامے کے بغیر مہمان خانے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ واپس جاؤ۔“

لڑکی آہستہ سے بولی۔ ”واپس چلے پرنس..... یہ سردار ضیغم کے باپ سردار قاہر ہیں۔

خدارا..... واپس چلے..... واپس چلے۔“

حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر گاڑی کو ریورس گیر میں ڈال دیا۔

”کب تک میری انگلی پکڑ کر چلتے رہو گے..... خیر اب یہ معلوم کرو کہ اس عمارت سے باہر نکلنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ اس کے بعد پھر مجھے کال کرنا۔ پھر کوئی مشورہ دے سکوں گا! اور اینڈ آل.....!“

حمید نے پھر ٹرانسمیٹر کا سوچ آف کر کے اسے جیب میں ڈال لیا۔ لباس تبدیل کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے سے ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ جس نے آدھی آستین کی سفید قمیض اور براؤن رنگ کی جین پہن رکھی تھی۔ بڑی اسٹارٹ اور دلکش تھی۔

”پرنس افتخار پلےز.....!“ اس نے قریب پہنچ کر کہا۔

”ہاں..... ہاں.....!“

”کیا آپ باہر جا رہے ہیں۔“

”ارادہ تو یہی ہے۔“

”مجھے سردار ضیغم نے بھیجا ہے تاکہ آپ تنہائی محسوس نہ کر سکیں۔“

”اپنے ملک میں یہ پہلا اچھا آدمی ملا ہے۔“ حمید مسکرایا۔

”چلے! میں آپ کو قلعہ کی سیر کراؤں گی۔“

”ابھی آپ بیٹھے..... میں ہاتھ روم تک جانا چاہتا ہوں۔“

حمید نے کہا اور اس کے ساتھ سٹنگ روم تک آیا اور پھر اپنے بیڈ روم میں واپس آ کر دوبارہ فریدی سے رابطہ قائم کیا۔ نئی تجویز کا ذکر کرتے ہوئے مشورہ مانگا۔

”مزے کرو..... ہر جگہ تمہاری نامعقول طبیعت کے بہلنے کا سامان ہو جاتا ہے۔ ضرور سیر کرو قلعے کی۔ اور اینڈ آل.....!“

”بہت اچھا سرکار۔“ حمید نے بڑبڑاتے ہوئے ٹرانسمیٹر جیب میں ڈالا اور سٹنگ روم میں واپس آ گیا۔ لڑکی چھوٹا سا آئینہ ہاتھ میں لئے اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ حمید اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”آپ کا لہجہ بہت پیارا ہے۔“ وہ آئینے کو دینی بیگ میں ڈالتی ہوئی بولی۔

”شکریہ.....!“

”میں نے سنا ہے کہ آپ کی پرورش فرانس میں ہوئی ہے۔“

عمارت کے اندر پہنچ کر لڑکی نے کہا۔ ”مجھے بے حد افسوس ہے پر نس۔“  
 ”افسوس تو مجھے بھی ہے لیکن.....!“  
 ”لیکن کیا.....؟“

”مجھے بالکل افسوس نہ ہونا چاہئے۔ تم اتنی خوبصورت ہو کہ میں تمہاری آنکھوں میں ساری دنیا دیکھ سکتا ہوں۔“

”ہائے اللہ کو بصورت..... ہائے پر نس..... کتنا پیارا لفظ۔“

”یہ بوڑھا ناراض کیوں ہو رہا تھا۔“

”مجھے خود بھی حیرت ہے..... آپ کے ساتھ یہ سلوک میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔“  
 ”بہت کوفناک تھا۔“

”ہاں پر نس..... وہ بہت خوفناک ہے۔ پیارے خان تو ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ قلعے پر اس کی حکومت ہے۔ سردار ضیغم جو اس کا بیٹا ہے اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔“

”تو یہ بے بی کان کاموں ہے۔“

”ہاں..... پر نس.....!“

”اچھا..... اچھا..... ذرا میں باتھ روم تک جاؤں گا۔“

”کتنی بار جاؤ گے باتھ روم میں۔“

”نروس ہوتا ہوں تو بار بار ضرورت پیش آتی ہے۔“

”تم نروس کیوں ہو پر نس.....!“

”اتنی خوبصورت لڑکی سامنے ہو تو نروس ہونا ہی پڑے گا۔“

اسے ڈرائینگ روم میں چھوڑ کر وہ پھر سونے کے کمرے میں آیا اور ٹرانسمیٹر پر فریدی سے رابطہ قائم کر کے موجودہ پوزیشن بتائی۔

”لڑکی رات کو وہاں نہ رہنے پائے..... اور.....!“ فریدی کی آواز آئی۔

”تم بھول رہے ہو..... اس بھیڑیے کی موت مجھے یہاں لانی ہے۔“

”بھیڑیا..... کس بھیڑیے کی بات کر رہے ہو۔“

”وہی جو دونوں بھائیوں کے درمیان افتراق کا باعث بنا تھا۔“

”گھاس کھا گئے ہو تم..... بکواس بند کرو اور خود کو زیر حراست سمجھو۔“

”ضرور سمجھوں گا اگر تم میرے ہاتھوں سے بچ گئے۔“ صدانی نے کہا اور دفعتاً جیب سے

اعشاریہ دو پانچ کا پستول نکال لیا جس کا رخ سردار قاہر کی طرف تھا۔

حمید اپنا سر سہلاتا ہوا لڑکی سے بولا۔ ”تم ادھر آ جاؤ..... میرے پاس..... یہ دونوں

آگ کی زبان میں گفتگو کرنے والے ہیں۔“

”ہاں لڑکی..... تم ادھر آ جاؤ..... پرنس کے پاس۔“ صدانی غرایا۔ اس کی پوری شخصیت

بدل کر رہ گئی تھی۔ خوش اخلاقی کا پیکر شعلہ جوالا بن گیا تھا۔

لڑکی دوڑتی ہوئی حمید کے پاس آ پہنچی اور وہ اس کا شانہ تھپکتا ہوا بولا۔ ”یہ دونوں پتہ

نہیں کس بات پر دوئل کر رہے ہیں۔“

”مجھے کہیں اور لے چلو پرنس..... لڑائی جھگڑا نہیں دیکھ سکتی۔“

”مفت بھی نہیں۔“ حمید نے حیرت سے پوچھا۔

حمید سردار قاہر کی طرف دیکھے جا رہا تھا جس کے چہرے پر کچھ دیر قبل پائی جانے والی

درندگی اس طرح غائب ہوئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

اس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور کسی قدر بے اطمینانی کی جھلکیاں بھی پائی جاتی تھیں۔

”ہم پورے آٹھ سال بعد ملے ہیں سردار قاہر۔“ صدانی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا

مسکرایا اور حمید سے بولا۔ ”پرنس آپ اس کو میرے پستول سے کور کئے رکھئے..... میں ابھی آیا۔“

حمید نے بڑی مستعدی دکھائی..... سردار قاہر کے دل کا نشانہ لے کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی

اب اس سے دور کھسک گئی تھی۔

صدانی کے چلے جانے کے بعد سردار قاہر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تمہاری

شادی بے بی خان سے ہو سکتی ہے..... اگر میں چاہوں۔“

”کوفناک آدمی..... میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔ میرا نشانہ بہت چھپا ہے۔“

”پستول جیب میں رکھ لو بیٹے..... میں بے بی خان کا ماموں ہوں۔“

”ماموں کیا ہوتا ہے۔“

”اس کی ماں کا بھائی۔“

”بڑھا آدمی میرا گارجین بن کر آیا ہے..... میں اس کا کہنا مانوں گا۔“

”بڑے نقصان میں رہو گے۔“

”اب تم کا موش کھڑے رہو۔“

”اتنے میں صدانی واپس آ گیا۔ اسکے دونوں ہاتھ پشت پر تھے۔ چند لمحے دروازے

میں کھڑا سردار قاہر کو گھورتا رہا پھر لڑکی سے بولا۔ ”تمہاری گاڑی باہر موجود ہے۔ فوراً یہاں

سے چلی جاؤ۔“

”ٹھہرو..... نہیں.....!“ سردار قاہر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”جاؤ.....!“ صدانی اتنے زور سے دہاڑا کہ دیواریں تک جھنجھٹا اٹھیں۔

لڑکی دوڑتی ہوئی چلی گئی۔

”اور اب پرنس آپ اسے کور کئے رکھئے..... میں اس کے بازو میں ایک انجکشن دوں

گا..... اور وہ انجکشن ہی اسے انسانیت کے جا بے میں لائے گا۔ ہم جیسے مہمانوں کی یہاں

بڑی تو بہن ہوئی ہے۔“

”تھیک ہے..... تم انجکشن لگاؤ..... اگر یہ اپنی جگہ سے ہلا بھی تو فائر کر دوں گا۔“

”بالکل..... بالکل.....!“

”بے بی کان کا ماموں.....!“ حمید نے کہہ کر طنزیہ تہقہہ لگایا۔

سردار قاہر دم سادھے کھڑا تھا لیکن انجکشن لگتے ہی اس کے حلق سے گھٹی گھٹی کراہ نکلی اور

وہ چکرا کر گر پڑا۔

”سان فرانسسکو.....!“ حمید نے متحیرہ جانے کی ایکٹنگ کی اور صدانی نے تہقہہ لگایا۔

”میں آپ کا خادم ہوں پرنس۔“ وہ اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا اور قریب پہنچ کر اس

کے ہاتھ سے پستول لینا چاہا۔

”بیلتم سے شیخ.....!“ حمید نے سر ہلا کر کہا۔

وہ جھکا ہوا بخور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سردار قاہر کراہ کر اٹھ بیٹھا۔ چند لمحے آنکھیں ملتا رہا۔ پھر جیسے ہی صدانی پر نظر پڑی ”ارے صدانی بھائی“ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”آپ کب آئے۔“

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔“ صدانی نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔  
”لل..... لیکن..... مم..... میں یہاں کہاں؟“ وہ چاروں طرف دیکھتا ہوا ہکلا یا۔  
”بھئی..... میں نے تمہیں اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ تم آئے اور اس کمرے میں قدم رکھتے ہی بیہوش ہو گئے۔“

”مجھے کچھ یاد نہیں صدانی بھائی۔“ سردار قاہر نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”کب سے بیمار ہو۔“

”میں نہیں جانتا صدانی بھائی۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ صدانی اس کا بازو پکڑے ہوئے صوفے کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔  
”میں ایک خاص مشن پر آیا ہوں۔“

”مجھے ضرور بتاؤ۔“ صدانی بھائی.....!“ سردار قاہر نے کہا اور صوفے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔  
”یہ شہزادہ افتخار ہیں۔ اقتدار الدولہ بہادر کے بیٹے۔“ صدانی نے حمید کی طرف اشارہ کیا۔  
”زہے عز و شرف۔“ سردار قاہر اٹھ کر کسی قدر جھکتا ہوا بولا اور پھر بیٹھ گیا۔

”جس طرح میرے باپ اقتدار الدولہ کو یہاں لائے تھے اسی طرح میں شہزادہ افتخار کو لایا ہوں۔“

”تو پھر محل میں تشریف لے چلے آپ لوگ..... یہاں کیوں مقیم ہیں۔“

”تمہارے بیٹے ضیغم نے ہماری یہ توقیر کی ہے۔“

”میں اسے گولی مار دوں گا صدانی بھائی..... آپ دونوں چلے میرے ساتھ۔“

”پرنس.....!“ صدانی حمید کی طرف مڑ کر بولا۔

”میں پہلے ہاتھ روم جاؤں گا۔“

”ضرور..... ضرور.....!“

وہ پھر ہنس پڑا اور بولا۔ ”میں آپ کا خادم ہوں..... جو کچھ میں نے کیا ہے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا..... ہوش میں آنے کے بعد یہ ہمیں اپنے سر پر بٹھائے گا۔“  
”تم بہت گہرے نکلے مسٹر صدانی۔“

”میرے باپ کو آپ کے دادا حضور کا باڈی گارڈ ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔“

”بہت کوب.....!“

”بہت خوب کہئے..... میرے سامنے بننے کی کوشش نہیں۔ آپ نے اچانک فرانسیسی انداز میں اردو بولنی شروع کر دی ہے۔“

”صرف اس لڑکی کے لئے موسیو..... وہ جسے تم نے بھگا دیا ہے۔ اس لہجے پر گلوڑ ماریاں جان دیتی ہیں۔“

”اوہو..... آپ گلوڑ ماریاں بھی بول سکتے ہیں۔“

”میری اتالیق سرال لکھنوی تھی۔“

”سرال.....!“ صدانی اسے گھورتا ہوا بولا۔ پھر اس نے کہا۔ ”براہ کرم آپ لڑکیوں کو دیکھ کر ریشہ خطی نہ ہو جایا کیجئے..... یہاں اب بھی سرال والے اسے پسند نہیں کرتے۔“  
”مجھے لفظ سرال ہی پسند نہیں۔ عجیب سی بدبو محسوس کرتا ہوں نام سن کر۔“

”خدارا خاموش رہئے..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ اس نے چاروں طرف دیکھ کر کہا اور اچانک پستول حمید کے ہاتھ سے چھپٹ کر کہا۔ ”آپ کے ہاتھ میں گلدستہ زیادہ حسین لگے گا، جو آپ اپنی بیوی کو پیش کریں گے۔“

حمید نے ذرہ برابر بھی اظہار نہ ہونے دیا کہ اس طرح پستول چھین لینے کا اس پر کیا اثر ہوا ہے۔

”وہ کونٹاک ہے۔“

”کون.....؟“

”بے بی کان.....!“

صدانی ہنس کر رہ گیا۔ اس کی تو شخصیت ہی حیرت انگیز طور پر بدل گئی تھی۔

اچانک سردار قاہر کے جسم میں جنبش ہوئی اور صدانی اس کے قریب پہنچ گیا۔

”قاہر بھائی ابھی ابھی تشریف لے گئے ہیں۔“ صدائی نے نرم لہجے میں کہا۔

”تم نے ان پر ریوالتانا تھا۔“

”یہ کیا بکواس ہے لڑکے میں تمہارے باپ کا دوست ہوں۔ میرا احترام کرو وہ مجھے

صدائی بھائی کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔“

”ہاں یہ تھیک ہے موسیو زیگم..... میں نے بھی سنا تھا۔“ حمید بولا۔

”تم خاموش رہو۔“ ضیغم کا لہجہ اہانت آمیز تھا۔

”موسیو زیگم مجھے بھی جلد حراہ آ جاتا ہے۔“

”بکواس بند کرو۔ لڑکی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی موسیو زیگم.....!“ حمید نے مغموں لہجے میں کہا۔

”تمہارے فادر کہہ گئے ہیں وہ ہمیں جلد ہی محل میں لے چلیں گے۔ دیکھوں بے بی

کان کیسی ہے۔“

”شٹ اپ..... اس کا نام نہ لینا..... ورنہ سر توڑ دوں گا۔“

”کیا تم اس سے محبت کرتے ہو۔“

”لڑکے.....!“ دفعتاً صدائی غرایا۔ ”میں پرنس کی شان میں گستاخی نہیں برداشت

کر سکتا۔ اب تمہاری زبان سے کوئی ناروا جملہ ادا ہوا تو میرا تھپڑ تمہارے منہ پر پڑے گا۔“

”ضیغم غراتا ہوا صدائی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ حمید بچ میں آ گیا۔ ضیغم نے اسے دھکا

دینا چاہا لیکن حمید نے جوڑو کے ایک داؤ کے ذریعہ اس کو منہ کے بل گر جانے پر مجبور کر دیا۔

اس کے دونوں محافظ خبردار خبردار کہتے ہوئے آگے بڑھے اتنے میں ضیغم بھی دوبارہ اٹھ

کر حمید پر چھوٹا۔ حمید اگر ایک طرف ہٹ نہ جاتا تو اس بار اسے خاصی چوٹ کھانی پڑتی۔ ضیغم

فولاد کی طرح ٹھوس تھا۔

باڈی گارڈز نے فائرنگ شروع کر دینے کی دھمکی دی تھی کہ صدائی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”سردار قاہر کا بیٹا اتنا بے بس ہے کہ دو بندوچی ساتھ لے پھرتا ہے۔“

”نکل جاؤ..... چلے جاؤ۔“ ضیغم باڈی گارڈز کی طرف ہاتھ اٹھا کر دباڑا۔

وہ جہاں تھے وہیں تھم گئے اور کھڑے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکاتے رہے۔

حمید انہیں وہیں چھوڑ کر پھر اپنی خواب گاہ میں آیا اور دروازہ بولٹ کر لے ٹراسمیٹر نکالا۔

فریدی سے رابطہ قائم ہونے میں دیر نہ لگی۔ نئے حالات سے آگاہ ہونے کے بعد

فریدی نے کہا۔ ”بہت اچھی خبر ہے۔“

”خدارا.....!“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”اب تو مجھے اصل حالات سے آگاہ

کر دیجئے۔ کہیں بے خبری میں کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں اور۔“

”پردہ مات کرو..... اور اینڈ آل.....!“

فریدی کی آواز پھر نہ سنائی دی۔ حمید اسے پکارتا ہی رہ گیا۔

وہ پھر ڈرائیونگ روم میں واپس آیا۔ یہاں وہ دونوں آنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو

ایسی پرشوق اور محبت آمیز نظروں سے دیکھے جارہے تھے کہ حمید کو چکر آ گیا۔

حمید کی آہٹ پر چونکے اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔

”آپ بھی تشریف رکھئے پرنس.....!“ صدائی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

دفعتاً سردار قاہر اٹھتا ہوا بولا۔ ”اچھا صدائی بھائی..... اب اجازت دو۔ محل جا کر آپ

لوگوں کے شایان شان استقبال کا انتظام کروں گا۔“

”بہت اچھا قاہر بھائی۔“ صدائی نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

حمید کی طرف دیکھ کر سردار قاہر احتراماً جھکا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

صدائی نے اپنی گھڑی دیکھی اور مسکرا کر بولا۔ ”آٹھ گھنٹے تک یہ مجھے اسی طرح صدائی

بھائی کہتا رہے گا۔ لہذا ضروری ہے کہ ساتواں گھنٹہ گزرتے ہی اسے دوسرا انجکشن دیا جائے۔“

”صدائی چچا میں انجکشن کے بغیر ہی کہنے پر تیار ہوں۔“ حمید نے بوکھلاہٹ کی اداکاری

کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کا غلام ہوں پرنس! آپ ہی کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے۔ آپ کی توہین

ہوئی تھی اس لئے غصہ آ گیا۔“

پھر دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ سردار ضیغم دکھائی دیا اور اس کا چہرہ غصہ سے سرخ

ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ دو مسلح سپاہی بھی تھے جن کے ہاتھوں میں ریوالتا نظر آئے۔

”میرے باپ سردار قاہر کہاں ہیں۔“ وہ پیرچ کر دباڑا۔

تھی کہ اگر وہ دونوں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا بھی شروع کر دیتے تو انہیں حمید نہ دکھائی دیتا۔  
کچھ دیر بعد اس نے سردار قاہر کی بھرائی ہوئی سی آواز سنی۔ ”صدائی، صدائی بھائی.....

م..... مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں بار بار اس طرح سونے کیوں لگا ہوں۔“

”موسم کا اثر ہے..... فکر نہ کرو۔“

”ت..... تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے..... صدائی بھائی۔“

”بالکل نہیں۔“

”پرنس کہاں ہیں۔“

”اپنے کمرے میں..... وہ بیکاری میں زیادہ تر سوتے رہتے ہیں۔ خیر اب تم اصل معاملے کی طرف آ جاؤ۔“

”شش شادی..... ضرور ہوگی صدائی بھائی۔“

”وہ تو ہوگی ہی..... میں تم سے اس آدھے سرخ ٹکڑے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”خ..... خطرہ ہے صدائی بھائی۔“

”فضول باتیں نہیں..... آدھا ٹکڑا مجھے ہر حال میں چاہئے۔“

”وہ تو نہیں ہے میرے پاس.....!“ قاہر کی آواز آئی۔

”وہ تو ہر حال میں مجھے چاہئے..... ورنہ بڑا خون خرابہ ہوگا۔“

”تت تلاش کرنا پڑے گا..... صدائی بھائی۔“

”ضرور تلاش کرو..... دس بجے رات تک مجھے مل جائے۔“

”لل لیکن صدائی بھائی..... اگر وہ مل بھی گیا تو۔“

”تمہیں اس سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔ تمہارا ہر حال میں خیال رکھا جائے گا۔“

”میں کہہ رہا تھا صدائی بھائی کہ وہ پرانی باؤلی کا قصہ ہے اور اب وہاں قدم رکھنا مشکل ہے۔“

”کیوں؟“

”بھیڑ یا..... بھیڑ یا..... باؤلی ہی سے نمودار ہوتا ہے۔“

”بکو اس ہے؟“

”یقین کرو صدائی بھائی۔ وہ اسی بھیڑیے کی روح ہے جو خان دوراں کے ہاتھوں مارا

”باہر جاؤ۔“ وہ پھر گرجا۔ انہوں نے اس بار مشینی انداز میں تعمیل حکم کی تھی۔  
ضیغم پھر حمید کی طرف جھپٹا۔ لیکن اس بار صدائی نے جیب سے دوبارہ پستول نکالتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ”ٹھہر جاؤ۔“

”یہ بد عہدی.....! ضیغم رک کر ہانپتا ہوا بولا۔ ”اب تم نے پستول نکالا ہے، بزدل بوڑھے۔“  
”لیکن میری نیت میں فتور نہیں ہے۔ میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی مجھے علم ہوا ہے کہ پرنس جوڈو کے ماہر ہیں۔ تم ان سے پار نہ پاسکو گے۔ دماغ ٹھنڈا رکھو..... دیوانگی اچھی چیز نہیں ہے۔“

قبل اس کے کہ ضیغم کچھ کہتا سردار قاہر کمرے میں داخل ہوا اور انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

پھر ضیغم سے بولا۔ ”یہاں سے چلے جاؤ بد تیز..... کیا تم صدائی بھائی سے جھگڑا کر رہے ہو۔ یقیناً تم نے گستاخی کی ہوگی۔ ورنہ ہرگز پستول نہ نکالتے۔ تمہیں بھتیجا سمجھ کر شفقت سے پیش آتے۔“

حمید نے ضیغم کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے اور صدائی نے مسکرا کر پستول پھر جیب میں ڈال لیا۔ اب ضیغم اپنے باپ کو گھورتا ہوا واپس جا رہا تھا۔

”صدائی بھائی اسے معاف کر دیجئے۔“ سردار قاہر گڑ گڑایا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ محل کے ایک خوبصورت حصے میں فروکش تھے اور سردار قاہر بڑی لجاجت سے کہہ رہا تھا۔ ”صدائی بھائی..... بیگم ظفر یاب یعنی میری چھوٹی بہن..... یعنی بے بی خان کی والدہ..... ہر چند کہ اس رشتہ پر متفق نہیں لیکن میں انہیں راضی کر لوں گا۔“  
”دونوں خاندانوں کی بہتری اسی میں ہے۔“

شام تک حمید بور ہوتا رہا۔ اپنے کمرے سے نکلا تو سردار قاہر کو پھر بے ہوش دیکھا۔ وہ ایک آرام کرسی پر پڑا ہوا تھا اور صدائی اس کے قریب ہی اخبار بینی میں مصروف تھا۔ اس کی پشت حمید کی طرف تھی۔ حمید خاموش کھڑا رہا۔ صدائی کو اس کی آہٹ نہیں مل سکی تھی۔ کیونکہ چاروں طرف یہاں فرش پر موٹے موٹے قالین پڑے ہوئے تھے۔

حمید دبے پاؤں چلتا ہوا ایک بہت بڑے آرائشی گلدان کے پیچھے جا چھپا۔ پوزیشن ایسی

”اوہو..... تم سمجھتے نہیں سردار قاہر..... پرئس دوسروں کو متخیر کر دینے میں بے حد لذت

محسوس کرتے ہیں۔ اسے ان کی ہالی سمجھ لو۔“

”اچھا یہ بات ہے صدیقی بھائی۔“ سردار قاہر ہنسنے لگا اور حمید نے محسوس کیا جیسے دردانہ اسے پاگل سمجھ رہی ہو۔

اچانک دردانہ بولی۔ ”مجھے حیرت ہے ماموں حضور۔“

”کس بات پر حیرت ہے بیٹی۔“

”مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کی پوری شخصیت بدل کر رہ گئی ہو۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں بیٹی! میں اور صدیقی بھائی بچپن سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔“

”تو کیا یہ واقعی پرئس افتخار ہیں۔“

”ہاں بیٹی..... بھلا اس میں شبہ کی گنجائش کہاں۔“

پھر وہ مزید کچھ کہے سے بغیر واپس مڑ گئی۔ حمید اس موقع کو ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ بڑی

مشکل سے تو دوبارہ سامنا ہوا تھا۔ وہ اس کے پیچھے چل رہا پڑا اور لان پر پہنچ کر ہی دردانہ کو معلوم ہوسکا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔

وہ رک کر مڑی اور پرتفر لہجے میں بولی۔ ”تم کوئی بھی ہو۔ مجھے تم سے قطعاً دلچسپی نہیں۔“

”کم از کم فرانس میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ لڑکیاں اتنی بے مروتی سے پیش نہیں آتیں۔“

”تو پھر یہاں مرنے کیوں آئے ہو..... فرانس ہی واپس جاؤ۔“

”مرنا تو یہیں ہے..... لڑکیاں لفٹ دیں یا نہ دیں۔“

”میرے پیچھے مت آؤ۔“

”کم از کم چچی حضور سے تو مل ہی لوں۔“

”وہ نہیں ملنا چاہتیں۔“

”چچا حضور کی کیسی طبیعت ہے۔“

”پہلے سے بہتر ہے۔ لیکن کوئی ان سے مل نہیں سکتا۔“

”اچھا تو میری تصویر ہی ان تک پہنچا دو۔“

”کیوں.....؟“

گیا تھا۔“

”میں کہتا ہوں بکواس مت کرو۔“

”تمہاری مرضی! میں تلاش کرنے جا رہا ہوں لیکن اگر وہ نکلوانہ ملا تو۔“

”تمہارے پرچے اڑ جائیں گے۔“

”بات دراصل یہ ہے صدیقی بھائی کہ وہ ضیغ کے پاس ہے۔ ضیغ بڑا گستاخ لڑکا ہے

اور مجھے بھی خاطر میں نہیں لاتا۔“

”میں کچھ نہیں جانتا..... لیکن دیکھو ضیغ کو اس کا علم نہ ہونے پائے کہ میں نے اس

مطالبہ کیا ہے۔“

”ارے چور۔“ دفعتاً حمید نے اپنی پشت پر کسی لڑکی کی چیخ سنی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”اوہو..... بے بی کان..... دیل کم..... دیل کم.....!“ وہ سیدھا کھڑا ہو کر کھسیانی ہنسی

کے ساتھ بولا۔

قاہر اور صدیقی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دردانہ نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔ ”

شہزادے صاحب ادھر چھپے ہوئے آپ لوگوں کی گفتگو سن رہے تھے۔“

”میں ہر دکت اردو سیکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں..... میں نے سوچا شاید یہ لوگ گفتگو

میں نئے نئے محاورے استعمال کریں۔ اس لئے مجھے فائدہ اٹھانا چاہئے۔“ حمید نے کہا

ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

## بھڑیئے کا حملہ

حمید ہنسے جا رہا تھا اور وہ سب دم بخود کھڑے تھے۔ دردانہ کی نظر اپنے ماموں سردار قاہر

کی طرف تھی اور وہ کسی قدر متخیر بھی دکھائی دیتی تھی۔

دفعتاً سردار قاہر نے حمید سے کہا۔ ”پرئس! ایسی بات تھی تو آپ کو ہمارے پاس بیٹھنا تھا۔“



”انہیں اطمینان ہو جائے کہ میں بھی بہت خوبصورت ہوں۔“

”تم.....!“ وہ تحقیر آمیز انداز میں ہنس پڑی۔

”نہیں ہوں.....؟“

”گھسیارے معلوم ہوتے ہو۔“

”یہ کیا ہوتا ہے..... میں گھسیارے کے معنی نہیں جانتا۔“

”اپنی کسی مقامی گرل فرینڈ سے پوچھ لینا۔“

”بے بی کان! میں نے سادھوؤں کی سی زندگی گزاری ہے۔ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں۔“

”حالانکہ تم صورت سے ہی بد معاش لگتے ہو۔“

”تمہارے ہی پردادا میرے بھی تھے۔“

”شٹ اپ.....!“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ضیغم آتا دکھائی دیا۔ دردانہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔“

”ضیغم حمید کو گھورتا چلا آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر دہاڑا۔“ یہاں قیام کرنے کا مطلب یہ نہیں

”کہ تم جہاں چاہو آزادی سے گھومتے پھرو۔“

”میرے چچا حضور کا محل ہے۔“ حمید نے سرد لہجے میں کہا۔

”چلے جاؤ۔“ وہ اس کے اقامتی حصہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر دہاڑا۔

”موسیوزیگم..... بد تمیزی نہیں۔“

بس اتنا ہی کافی تھا۔ ضیغم دوپہر کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے حمید پر جھپٹ پڑا۔

پہلے ہی سے اس کے لئے تیار تھا۔ کنائی کاٹ کر اس کا وار خالی دیا اور پھر جو ایک داؤ جوڑوا

لگایا ہے تو ضیغم اچھل کر دور جاگرا۔ بھاری بھر کم آدی تھا اس لئے پھرتی سے اٹھ نہ سکا اور حمید

دردانہ کی طرف مڑ کر بولا۔ ”یہ بہت پیوکوف آدی ہے۔ اسے یہاں سے لے جاؤ۔ ورنہ

میرے ہاتھوں سے مارا جائے گا۔“

”میں تجھے پیس کر رکھ دوں گا۔“ ضیغم اٹھتا ہوا چیخا۔

”سچ سچ اس بار جھپٹنے کا ایسا ہی انداز تھا جیسے مرنے مارنے کی ٹھان لی ہو۔“

حمید پھرتی سے جھکا اور اسے اپنی پشت پر اٹھا کر پھر دور پھینک دیا۔

دردانہ کھڑی حیرت سے پلکیں جھپک رہی تھی۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ دھند کا

پھیلنے لگا تھا۔ لیکن ابھی اتنی روشنی تھی کہ وہ دور سے بھی پہچانے جاسکتے۔

اس بار ضیغم اٹھا تو خالی ہاتھ نہیں تھا اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ ہانپتا ہوا بولا۔ ”اب تم

زمین پر ناک رگڑو..... ورنہ گولی مار دوں گا۔“

”ضیغم بھائی..... یہ بزدلی ہے۔“ دفعتاً دردانہ بولی۔

”تم چپ رہو..... اندر جاؤ۔“

اتنے میں برآمدے میں صمدانی کی لکار سنائی دی۔ ”دیکھو قاہر تمہارے لڑکے نے پرنس

پر ریوالور تان رکھا ہے۔ یہ اتنا جھگڑا کیوں ہے؟“

اس کے بعد وہ دونوں جھپٹتے ہوئے لان پر پہنچے تھے۔ ”ضیغم..... تمہارا دماغ تو نہیں

چل گیا۔ ریوالور ہولسٹر میں رکھ لو۔“ قاہر نے کہا۔

”آپ اندر جائیے..... میں یہاں کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوں۔“ ضیغم کا جواب تھا۔

”فض..... ضیغم بیٹے.....!“ قاہر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”م..... مجھ سے ایسے

لہجے میں گفتگو۔“

”تھپڑ رسید کیجئے ماموں جان..... یہ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔“ دردانہ بھرگی۔

”شٹ اپ!“ ضیغم دہاڑا۔ ”تم سب اندر جاؤ..... ورنہ اپنی بے عزتی کے خود ذمہ دار

ہو گے۔ چلو جاؤ۔“

اس نے بڑے ڈراؤنے انداز میں اپنے ریوالور والے ہاتھ کو جنبش دی تھی۔

”چلو..... چلو.....!“ صمدانی نے مغموں لہجے میں کہا۔ ”اس وقت اسی کا کہنا کر دو۔ اس

کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔“

”تم سے تو میں ابھی نپٹتا ہوں۔“ ضیغم نے صمدانی کو دھمکی دی۔

”بزرگوں کے منہ نہیں آیا کرتے بیٹے! معلوم نہیں تمہاری تربیت کیسے ہوئی ہے۔“

”سچ چلو..... صمدانی بھائی۔“ قاہر نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے اس سے خوف

محسوس ہو رہا ہے۔“

وہ سب ضیغ کو وہیں چھوڑ کر اندر آ گئے تھے۔  
دردانہ قاہر کو گھورے جاری تھی اور قاہر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا فرش کو تک رہا تھا۔

”شائد میں خواب دیکھ رہی ہوں۔“ دردانہ بڑبڑائی۔  
”جاگتے میں.....!“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے زمین اپنے محور سے ہٹ گئی ہو۔  
یہ ماموں جان ہیں۔ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ تو اس وقت ضیغ بھائی کی کھال اتار دیتے۔“

”اللہ جب چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔“ صدانی نے کہا۔  
”ناممکن..... مجھے یقین نہیں آتا۔“ دردانہ اسے گھورتی ہوئی بولی۔ چند لمحے کچھ سوچ

رہی پھر ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”تم بھی بالکل بدلے ہوئے نظر آتے ہو۔ جب میں نے تمہیں ٹرا  
میں دیکھا تو تم کچھ اور تھے۔“  
قبل اس کے کہ صدانی کچھ کہتا حمید باتھ روم کے بہانے وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ ا

پھر فریدی سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ حالات گنگناک ہو گئے تھے۔ صدانی جدوجہد پر اسرار ثابت  
ہوا۔ اس کی شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔  
حمید نے فریدی کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کرتے ہوئے پوچھا کہ اب اسے کیا کر

چاہئے۔  
”دونوں پر کڑی نظر رکھو.....!“ فریدی نے جواب دیا۔ ”یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش  
کرو کہ ان دونوں کے درمیان اس گفتگو کا مقصد کیا تھا۔ تم یہ سوال براہ راست صدانی سے ا

کر سکتے ہو..... اور.....!“  
”آخر یہ بیھڑیا کیا بلا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔  
”بے صبری اچھی چیز نہیں۔ جلد معلوم ہو جائے گا اور اینڈ آل.....!“

گفتگو ختم کر کے حمید پھر ڈرائنگ روم میں واپس آیا۔ صدانی تنہا تھا۔ حمید کو دیکھ کر کہ  
ہو گیا اور مسکرا کر بولا۔ ”پرنس چھپ کر ہماری گفتگو سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے آپ  
ساتھ بیٹھنے میں اقتدار الدولہ بہادر کی کچھ مصلحت اور بھی تھی۔“

”اگر کچھ حرج نہ ہو تو میں بھی ان کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔“ حمید نے کسی آ  
”دل دکھانے کے باتیں نہ کرو۔ میں تو بہت بُرا ہوں۔“

”لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اسی بھڑیے کا بھوت ہے جو دادا حضور کی رائفل کا نشانہ بنا تھا

اور تمہارے دادا خواہ مخواہ بور ہو گئے تھے۔ سچ کہتی ہوں مجھے اس کہانی پر بہت ہنسی آتی ہے۔“  
”ہنسی کیوں آتی ہے؟“

”آخر یہ لوگ اتنے احمق کیوں ہوا کرتے ہیں۔ اتنی ذرا سی بات پر اس حد تک ناچاقتی۔“  
”نہیں انہیں کچھ نہ کہو..... وہ بہت پیارے اور سچے لوگ تھے۔ کھل کر نفرت کرتے تھے

اور پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا..... نہ نفرت نہ محبت.....  
لوگ مصلحتاً ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں اور زندگی بھر اداکاری کرتے رہتے ہیں۔“  
”تم بہت گہری باتیں بھی کر سکتے ہو.....!“ وہ دلاؤ پر مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں صدائی کے لئے کیا کروں۔“ حمید نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”اگر ان کے مقدر میں موت لکھی ہے تو ضیغم کے ہاتھ سے ضرور مارے جائیں گے۔  
مجھے حقیقتاً اپنے ماموں اور ضیغم سے بے اندازہ نفرت ہے۔ لیکن امی حضور کی وجہ سے برداشت کرنا پڑتا ہے۔“

”تمہیں ان دونوں سے نفرت کیوں ہے۔“

”میں نہیں جانتی۔“

”اچھا..... بھڑیے کے بارے میں بتاؤ اور یہ پرانی باؤلی کیا چیز ہوتی ہے۔“

”ہاں یہ بات ہوئی۔“ وہ اس کے چہرے کے قریب انگلی نچا کر ہنسی اور پھر بولی۔

”یہاں دھری رہ گئی اردو کی ساری قابلیت اب بلاؤ۔ اپنی اتالیق کے لکھنوی میاں کو۔“

”تم ہی بتا دو..... اے میری بنت عم.....!“

”پرانے زمانے میں بڑے بڑے کنوئیں بنوائے جاتے جن کے اندر چاروں طرف پانی سے کچھ اوپر کمرے اور دالانیں تعمیر کی جاتیں تھیں جن میں گرمیوں کی دوپہریں گزاری جاتی تھیں۔“

”اوہو..... تو یہاں کوئی ایسی چیز موجود ہے۔“

”ہاں..... آں..... وہی پرانی باؤلی کہلاتی ہے۔ لیکن عرصہ دراز سے اسے استعمال

”ضیغم کی طرح بزدل تو نہیں ہو..... اس نے صدائی صاحب کو مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ کسی طرف نکل گئے۔“

”اوہو..... اچھا.....!“ حمید بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”وہ ان سے کسی چیز کا مطالبہ بھی کر رہا تھا.....؟“

”کس چیز کا.....؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی..... میں نے دونوں کی گفتگو سنی ضرور تھی لیکن دونوں ہی مبہم انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ مثلاً ضیغم نے صدائی صاحب سے کہا تھا۔ ”میں نے ابا جان سے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ تم زندہ بچ کر نہیں جاسکو گے۔ لاؤ آدھا ٹکڑا میرے حوالے کر دو۔“

”اوہو..... پھر کیا ہوا۔“

”ایسا پھر تیرا بوڑھا آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا..... اس نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی اور غائب ہو گیا۔ ضیغم کے آدمی اسے چاروں طرف ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“  
”یہ تو بہت بُرا ہوا۔ میں تمہارہ گیا۔“

”تم میرے چچا کے بیٹے ہو..... تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔“

”ارے..... تم بھی تو بھڑیے کی طرح گزرتی ہو۔“

دردانہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ”وہ تو مذاق تھا۔ لیکن مجھے اس غراہٹ کے لئے بڑی پریکٹس کرنی پڑی تھی۔“

”ایسا کیوں کرتی ہو۔“

”مجبوراً مجھے صبح دیر تک سونے کی عادت ہے۔ امی حضور اس کی مخالف ہیں۔ میری خادمہ کو حکم ہے کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے مجھے اٹھا دیا کرے۔ اب عالم یہ ہے کہ جہاں اس نے مجھے جگانے کی کوشش کی میں نے غرانا شروع کر دیا۔ بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور امی حضور سے کہہ دیتی ہے کہ وہ ان کا حکم بجالائی ہے۔“

”بہت چالاک ہو۔“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔

”اور میری خادمہ یہ سمجھتی ہے کہ اس غراہٹ کا تعلق پرانی باؤلی والے بھڑیے سے ہے۔“

”یہ باؤلی والا بھڑیا کیا مصیبت ہے۔“

”اچھا..... اچھا..... کیا تم نہیں کھاؤ گی میرے ساتھ۔“  
”چلو..... میں بھی کھالوں گی۔ جلدی کرو۔“

کھانے کے دوران میں خاموشی رہی۔ اس کے بعد حمید نے تمباکو نوشی کے لئے پائپ نکالا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔ ”نہیں..... یہاں نہیں۔“  
”تمہاری مرضی۔“ حمید نے پائپ کو جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔  
”وہ دونوں عقبی دروازے سے باہر نکلے۔ باہر گہرا اندھیرا تھا۔ اس جھسے میں کہیں بھی روشنی دکھائی نہ دیتی تھی۔

حمید نے اپنی چھوٹی سی دونالی بندوق کوٹ کی داہنی آستین میں چھپا رکھی تھی۔  
وہ عمارات کے سلسلے سے دور ہوتے گئے۔ اچانک انہوں نے کسی مرد کے رونے کی آواز سنی جو ان کے چلنے ہی کی سمت سے آرہی تھی۔ دونوں رک گئے۔ آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔

”میرے مہمان..... میرے مہمان..... ہائے میرے مہمان..... خداوند! میں کیا کروں۔ ہائے روسیاء ہو گیا۔“ اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا گیا۔  
”یہ..... یہ ضیغم بھائی کی آواز ہے۔“ دردانہ آہستہ سے بولی۔

”میں پھانسنے کے لئے جال پھیلایا ہے اس نے۔“  
”خدا جانے.....!“ دردانہ کا لہجہ پر تشویش تھا۔  
وہ ایک درخت کے موٹے سے تنے کی اوٹ میں ہو گئے اور ضیغم دھاڑیں مار مار کر روتا ہوا ان کے قریب ہی سے گزر گیا۔

حمید سوچ رہا تھا کہ کہیں صدائی کا داؤ نہ چل گیا ہو۔ لگا دیا ہو اس کے بھی انجکشن..... آدی تھا یا بھوت..... لیکن اب وہ خود کہاں ہوگا۔ باپ بیٹے دونوں ہی قابو میں آ گئے لیکن وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ کیا چکر ہے..... باؤلی اور ریشم کے ٹکڑوں کا کیا قصہ ہے۔“  
”ضیغم کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ دفعتاً اس نے دردانہ سے کہا۔“ ہم کب تک یہاں کھڑے رہیں گے۔“

”نہیں کیا گیا۔ پہلے ہی سے آسیب زدہ تھی۔ اب وہاں کسی بھیڑیے کا بھوت بھی آسا ہے۔“  
”وہ کب سے آیا ہے۔“

”غالباً پچھلے تین سال سے۔“  
”کیا محل والوں پر بھی اس نے کبھی حملہ کیا ہے۔“  
”نہیں تو.....!“  
”پھر وہ اس بھیڑیے کا بھوت کیسے ہو سکتا ہے۔“

”میں نہیں جانتی۔ قلعے کے غوام یہی کہتے ہیں کہ وہ بھوت ہے اور محل والے اس کی تردید کرتے پھرتے ہیں تاکہ لوگوں کا خوف دور ہو سکے۔ ہمارے سپاہیوں نے کئی بار اس کا تعاقب کر کے اس پر گولیاں بھی چلائی ہیں لیکن وہ اب بھی زندہ ہے۔“  
”میں اس کو ماروں گا۔“

”اپنے چار سونوں کے کھلونے سے۔“  
”اس کی ہنسی نہ اڑاؤ وہ بہت کوفناک چیز ہے۔“  
”اچھا اب میں جا رہی ہوں..... یہاں سے نکلنا نہیں۔ ورنہ تم خود ہی کسی حادثے کے ذمہ دار ہو گے۔“

”نہیں نکلوں گا۔“  
وہ چلی گئی اور حمید نے پھر ٹرانسمیٹر نکالا۔ لیکن اس بار فریدی سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔  
آدھے گھنٹے تک تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ اسے کال کرتا رہا لیکن ناکامی ہی ہوئی۔  
اس کے بعد دردانہ پھر آ گئی اور اسے یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ وہ اس کے لئے ایک بڑے سے ناشتہ دان میں کھانا لائی تھی۔

”صدائی کا پتہ چلا۔“ حمید نے اس سے پوچھا۔  
”ضیغم بھی غائب ہو گیا ہے۔ تم جلدی سے کھانا کھا لو..... پھر میں تمہیں یہاں سے بھی لے چلوں گی۔“

”اوہو..... اب میں چوروں کی طرح زندگی بسر کروں گا۔“

”جو میں کہوں کرتے رہو..... ورنہ پھانسنے ہوگا۔“

”کچھ ہی ہو..... دھوکا ہوا کوئی ماردوں کا۔ حمید نے کہا اور ضیغم کو آوازیں دینے لگا۔

”پرنس آپ کہاں ہیں!“

”میں یہاں ہوں۔“

”کیا آپ نے فار کئے تھے۔“

”ہاں..... بھیڑ یا میرا پیچھا کر رہا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ وہ میرا پالتو بھیڑیا ہے۔“ ضیغم کی آواز آئی۔

”خداوند!.....!“ دردانہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”میں تصور بھی نہ کر سکتی۔“

”اچھا اب تم چپ چاپ یہاں سے چلی جاؤ۔“ حمید نے اس سے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھے۔“

”میرے خیال سے بھی یہی مناسب ہے۔ لیکن تم ہوشیار رہنا۔“ دردانہ نے کہا اور اس کے پاس سے ہٹ گئی۔

اتنے میں ضیغم اسی درخت کے قریب پہنچ گیا جس کے نیچے حمید کھڑا تھا۔ ضیغم نے نارنج روشن کی اور حمید پر نظر پڑتے ہی گڑگڑانے لگا۔ حمید نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔“

اچانک بائیں جانب سے صدائی کی آواز آئی۔ ”ضیغم..... میرے بچے میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ خدا سب کو نرم دلی عطا کرے.....!“ قریب پہنچ کر اس نے ضیغم کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ”چلو میرے ساتھ اور پرنس آپ جا کر آرام کیجئے۔“

پھر حمید وہیں کھڑا رہ گیا تھا اور وہ دونوں آگے بڑھ کر اندھیرے میں گم ہو گئے تھے۔

## وائر ریکارڈر

پھر حمید اندھیرے میں راستہ بھول گیا تھا اور آدھے گھنٹے تک ادھر ادھر بھٹکتے رہنے کے

”وہ بہت دور نکل چکا ہے۔“

”غغ..... غراہٹ کی آواز۔“

حمید نے ضیغم کی آواز کی طرف سے توجہ ہٹائی ہی تھی کہ غراہٹ بھی سن لی۔ یہ غراہٹ بھی قریب کی نہیں تھی۔ سمت کا اندازہ بھی نہ ہو سکا۔

”بہتر ہوگا کہ اب ہم یہیں ٹھہر کر اس کا بھی انتظار کریں۔“ حمید نے کہا۔

”مم..... مجھے خوف معلوم ہو رہا ہے۔“

”بالکل نہ ڈرو..... چار سو دس بور کا کھلونا میرے پاس موجود ہے۔“

غراہٹ قریب ہوتی جا رہی تھی اور اب حمید سمت کا تعین بھی کر سکتا تھا۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا انہیں کی سمت آ رہا ہے۔

حمید نے پھرتی سے بندوق نکالی اور آواز کی سمت فار کر دیا۔ غراہٹ کا سلسلہ یکلخت ٹوٹ گیا۔ ایسا لگا جیسے فار کی آواز نے بھیڑیے کے قدم روک دیئے ہیں۔ لیکن حمید کی چھٹی حس پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اب وہ بے آواز آئے گا۔

اس نے اسی سمت دوسرا فار بھی کر دیا۔ اس بار بھیڑیے کی آواز غراہٹ سے مختلف تھی اور یہ مسلسل آواز تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔

”اس بار زخمی ہو کر بھاگا ہے۔“ حمید بڑبڑایا۔

”مجھے تو نہیں دکھائی دیا تھا تم نے کیسے دیکھ لیا۔“

”میں آواز پر نشانہ لگاتا ہوں۔“

اچانک دوڑتے ہوئے قدموں کی آہٹ ہوئی اور وہ چونک پڑے۔ دوڑنے والا چیخنے لگا تھا۔ ”کون فار کر رہا ہے..... سامنے آئے..... پرنس..... صدائی صاحب۔“

”ضیغم بھائی۔“ دردانہ آہستہ سے بولی۔ ”شائد فاروں کی آوازیں کر پٹ آئے ہیں۔“

”صدائی صاحب..... پرنس! خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ میں شرمندہ ہوں۔“

مجھے مہمانوں کا احترام کرنا چاہئے تھا۔“ ضیغم بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

”میں تو اب اس سے ملوں گا۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”کہیں دھوکا نہ ہو۔“

بعد جائے رہائش تک پہنچ سکا تھا۔

صمدانی نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

”مجھے افسوس ہے پر نس کہ آپ کو تھوڑی سی تکلیف اٹھانی پڑی۔“ اس نے کہا۔ ”اب آپ سچ جُج آرام کیجئے۔ بقیہ معاملات میں خود ہی دیکھوں گا۔ آخر ہمارے گھرانے پر اسی لئے تو آپ کے اجداد اتنا اعتماد کرتے تھے۔“

حمید کراہتا ہوا آرام کرسی میں گر گیا۔ صمدانی نے تالی بجائی اور ایک ملازم اندر داخل ہوا۔ ”بلیک کافی..... تیز گرم.....!“ اُس نے اس سے کہا اور وہ تعظیماً جھک کر واپس چلا گیا۔ ”اس طرح آپ کی تھکن دور ہو جائے گی اور آپ آرام سے سو سکیں گے۔“ صمدانی حمید کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔

”چچا صمدانی.....!“ حمید اٹھ کر سیدھا بیٹھتا ہوا بولا۔ ”آخر ضیغ کیسے سیدھا ہو گیا۔“

”وہی انجکشن پر نس! اگر شیر کو دے دیا جائے تو اسے بکریاں سینگوں پر رکھ لیں گی۔“

”کس طرح.....!“

”کنپٹی پر پڑنے والے ایک گھونے نے اسے بیہوش کیا تھا اور پھر انجکشن دینے میں آسانی ہو گئی تھی۔“

”تم حیرت انگیز ثابت ہوئے ہو چچا صمدانی۔“

”آپ کے اجداد جو ہر شے کا تھے!“

”اوہ.....!“ حمید پیٹ دبائے ہوئے اٹھا اور صمدانی سے بولا۔ ”میرا معدہ..... پتہ

نہیں یہ لوگ کیا کھاتے کھاتے ہیں۔ میں ابھی آیا۔“

وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چل پڑا۔ ایک بار پھر اس نے ٹرانسمیٹر کے ذریعہ فریدی سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ جھلاہٹ میں اس نے سوچ آف کیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

پہلی نظر میں کمرہ خالی دکھائی دیا لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے قد آدم گلدان کے پیچھے کوئی چھپا ہوا ہو۔ غالباً اس نے نیلے رنگ کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی۔

وہ گلدان کی طرف جھپٹا اور دردانہ اچھل پڑی۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر اسے خاموش رہنے

کا اشارہ کیا۔ حمید نے متحیرانہ انداز میں ہلکی سی جھپٹ لیا۔

”بوڑھے نے کافی پاٹ میں ایک کپسول ڈالا تھا۔“ دردانہ آہستہ سے بولی۔ ”پھر اٹھ

کر باہر چلا گیا تھا۔ کیا تم کافی پینے کا ارادہ رکھتے ہو۔“

”اس نے میرے ہی لئے کافی منگوائی تھی۔ میں ذرا باتھ روم تک گیا تھا۔“

”کیا تمہیں بوڑھے پر اعتماد ہے۔“

”ابا حضور کو تو ہے..... پھر مجھے بھی ہونا چاہئے۔“

”وہ بے حد خطرناک آدمی ہے۔“

”اچھا میں دیکھ لوں گا..... تم اب یہاں سے چلی جاؤ۔“

”پھر کہتی ہوں..... کافی میں ہاتھ نہ لگانا۔“

”اچھا اچھا..... اب تم جلدی سے چلی جاؤ۔ کونفاک باپ، کونفاک بیٹا..... دونوں بکری

بن گئے۔ مجھے بھی تشویش ہے۔ صمدانی کو میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔“

”اوہ.....!“ دردانہ نے طویل سانس لی اور مسکرا کر بولی۔ ”اب میں مطمئن ہوں۔

جاری ہوں۔“

وہ چلی گئی۔ حمید اس میز کی طرف متوجہ ہوا جس پر کافی پاٹ اور دو تین کپ رکھے ہوئے

تھے۔ اس نے ایک کپ میں کافی انڈیلی اور اسے قد آدم گلدان میں الٹ دیا۔ تھوڑی سی کپ

میں باقی رہنے دی اور کپ کو دوبارہ کافی پاٹ کے قریب رکھ کر خود سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

جسم ڈھیلا چھوڑا اور آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر بعد اس نے تین آوازیں سنیں۔

صمدانی کہہ رہا تھا۔ ”اوہو..... پر نس کرسی ہی پر سو گئے۔ ایسا لاپرواہ اور جیوٹ کا جوان

آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“ ضیغ نے کہا۔ ”مجھے پھر تیلے پن پر حیرت ہوتی ہے۔ کوندے

کی لپک ہیں پر نس۔“

”لیکن تم بہت نالائق ہو۔“ یہ سردار قاہر کی آواز تھی۔

”مجھے ندامت ہے..... زندگی بھر رہے گی۔“ ضیغ کی آواز آئی۔



”یہ ناممکن ہے۔ میں بھی چلوں گی۔ پورے انتظام کے ساتھ آئی ہوں۔ میرے تھیلے

میں نارچ پستول اور وافر تعداد میں کارتوس موجود ہیں۔“

”بے بی کان..... وہاں گولیاں بھی چل سکتی ہیں۔“

”پستول اور کارتوس نمائش کے لئے نہیں لائی۔ چلو جلدی کرو۔ میزی اسپورٹ کار باہر

موجود ہے۔ وہ عام راستے سے گئے ہوں گے میں دوسری طرف سے لے چلوں گی۔“

”یہ اور بھی اچھا ہوگا۔“

کچھ دور چل کر اسپورٹ کار کچے راستے پر اتار دی گئی۔ دردانہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی

اور حمید سوچ رہا تھا۔ کاش وہ سچ مچ اس کی پچا زاد بہن ہوتی۔ ڈرائیوگ کے معاملے میں بھی

بڑی نڈر لڑکی تھی۔

”اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ زیکم بڑا کمینہ آدی ہے اور ماموں جان کو کیا کہوں۔ لیکن

یہ بُری بات ہے کہ زیکم نے بھیریا پال رکھا ہے اور یہ مشہور کرادیا ہے کہ وہ دادا جان والے

بھیرے کی روح ہے۔“

”آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔“

”دیکھو جگر کی تو پی سے کیا برآمد ہوتا ہے۔ پتہ نہیں باؤلی میں کیا ہے جسے محفوظ رکھنے

کے لئے وہاں ایک بھیریا ضروری سمجھا گیا۔ کیا میں گلت کہہ رہا ہوں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہاں ضرور کچھ ہے۔“

”اور وہ بوڑھا مردود میری شادی کرانے نہیں آیا باؤلی ہی کی کچھ بات معلوم ہوتی ہے۔“

”شادی کی بات نہ کرو۔“ دردانہ غرائی۔

”محبت کی کروں۔“

”بالکل خاموش بیٹھو۔“

”کیا تم اب تک مجھ سے ناراض ہو۔“

”میں سارے مردوں سے ناراض ہوں۔“

حمید پھر نہ بولا۔ گاڑی کچھ دیر بعد رک گئی اور دردانہ نے حمید سے اترنے کو کہا۔

دیے اس کے۔ لہجہ سے حمید نے اندازہ کر لیا کہ وہ اس کے اس طرح خاموش رہ جانے

حمید بدستور آنکھیں بند کئے گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔

”اب ہمیں یہاں سے فوراً چل دینا چاہئے۔“ صدائی بولا۔

”لہلہ..... لیکن پرنس.....!“ یہ ضیغم کی آواز تھی۔

”نہیں..... انہیں مت چھیڑنا..... بس روشنی بند کر کے نکل چلو۔ خود ہی جاگیں گے اور

اپنے بیڈ روم میں چلے جائیں گے۔ سونے سے جگایا جانا بالکل پسند نہیں کرتے، خواہ کہیں

سو گئے ہوں۔“

پھر حمید نے سوچ آف ہونے کی آواز سنی اور آنکھوں میں خفیف سادہ کر کے دیکھا۔

کمرہ تاریک تھا اس کے بعد کوئی آواز نہ سنائی دی۔

حمید نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔ بہر حال اسے تو ان کا

تعاقب کرنا تھا۔ اس لئے زیادہ دور اندیشی کو بھی راہ نہیں دی جاسکتی تھی۔

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ تیز قسم کی سرگوشی سنائی دی۔ ”پرنس..... تم

کہاں ہو۔“

”میں بے ہوش پڑا ہوں۔“ حمید نے بھی سرگوشی میں ہی جواب دیا۔

”چپ چاپ باہر نکل آؤ..... دور تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔“

وہ اندازے سے باہر نکل آیا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے پیروں کی چاپ سنی تھی۔

یہاں بھی اندھیرا تھا اور دردانہ اس کے قریب کھڑی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ ”تم نے

تو کمال کر دیا۔ بڑی خوبصورتی سے بیہوش ہوئے تھے۔ وہ لوگ پرانی باؤلی کی طرف گئے ہیں۔“

”پرانی باؤلی تک میری رہنمائی کرو۔“ حمید بولا۔

”یقیناً کروں گی۔ میں ڈر پوک تو نہیں ہوں۔ وہاں بھیریا بھی ہوگا۔ خدا کی پناہ ضیغم

نے کہا تھا کہ وہ اس کا پالتو بھیریا ہے۔“

”ہاں کچھ لوگ بھیرے بھی پالتے ہیں۔“

”یہ بات نہیں ہے وہ اب تک کئی لوگوں کی جانیں لے چکا ہے۔ تم خود سوچو..... میں

سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا ماموں زاد بھائی اتنا ذیت پسند ہوگا۔“

”ہمیں جلد از جلد ان کا پیچھا کرنا چاہئے۔ تم بس دور سے باؤلی دکھا کر واپس آ جانا۔“



پر کسی قدر ناراض ہے۔

”فراس میں عوریں آگے چلتی ہیں۔ بھ سے یہ بے ادبی نہیں ہو سکتی۔“

”باتیں نہ بناؤ..... چلو.....!“ وہ پیچھے ہٹ کر اسے آگے دھکیلتی ہوئی بولی۔ حمید گڈنڈی پر چلے لگا۔ اس کی چوڑائی دو فٹ سے زیادہ نہیں تھی اور دونوں جانب ان کے سروں سے اونچی جھاڑیاں تھیں۔

دفعاً حمید نے جیب سے وہ اسپرنگ نکالے جنہیں نتھنوں میں فٹ کر لینے سے دہانے کی بناوٹ تبدیل ہو جاتی تھی۔

باؤلی کے بالکل قریب پہنچ کر دردانہ نے ہوشیار رہنے کو کہا۔ وہ بہت بڑے قطر کا کنواں تھا۔ جسکی جگت کی اونچائی کم از کم تین فٹ ضرور رہی ہوگی۔ چار سیرھیاں طے کر کے وہ اوپر پہنچے۔ انہی سیرھیوں کی سیدھ میں نیچے جانے والے زینے تھے۔ شاید اسی دوران میں دردانہ کی نظر حمید کے چہرے پر پڑ گئی تھی۔

”اوہو..... یہ کیا.....؟“ وہ چونک پڑی۔

”کیا ہوا.....؟“

”تمہاری شکل.....!“

”فکر نہ کرو..... میں نہیں چاہتا کہ صمدانی مجھے پہچان سکے۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے اس مہم پر ساتھ نہیں لانا چاہتا تھا اسی لئے اس نے کافی میں بے ہوشی کا کپسول ڈالا تھا۔ ابا حضور کی ہدایت تھی کہ صمدانی کی مرضی پر چلوں۔ جو کچھ کہے وہی کروں۔“

”آخر تم میں کتنے کمالات ہیں..... اس طرح مسلسل اوپری ہونٹ اوپر اٹھائے رکھ کر گفتگو کرتے رہنا آسان کام تو نہیں ہے..... اور یہ ناک بھی تو اوپر اٹھ گئی ہے۔“ دردانہ نے اس کی ناک کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”ابھی نہیں..... بعد میں۔“

”خیر اب میں نارنج نہیں روشن کروں گی۔ دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ اترتے چلو۔ میں تمہارے کاندھے پر ہاتھ رکھ لوں گی۔“

وہ آہستہ آہستہ نیچے اترتے رہے۔ زینوں کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے درپچوں کے سلسلے نیچے تک چلے گئے تھے۔ ان سے ہوشیار رہنے کے لئے خاص طور پر دردانہ نے ہدایت کی تھی۔

”تم مجھے باؤلی تک پہنچا کر واپس جاؤ گی۔“ حمید نے اس سے کہا۔

”بیوقوفی کی باتیں نہ کرو..... تمہیں وہاں قدم قدم پر میری رہنمائی کی ضرورت پڑے گی۔“

”تمہیں بھیرے سے کوف نہیں معلوم ہوتا۔“

”تمہاری موجودگی میں خوف نہ معلوم ہوگا۔ اچھا اب خاموشی سے چلو۔“ دردانہ نے

اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف گھیسٹے ہوئے کہا۔

باؤلی کے قریب پہنچ کر وہ پھر کے تھے۔ یہاں دور تک قد آدم جھاڑیوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے اور باؤلی بھی انہیں کے درمیان کہیں پوشیدہ تھی۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ جھینگروں کی جھانک جھانک کے علاوہ اور کسی قسم کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

دردانہ نے نارنج روشن کی اور حمید کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی جھاڑیوں میں گھس پڑی۔ کچھ دور چلنے کے بعد جھاڑیوں کے درمیان ہی انہیں ایک جھوٹی سی کار دکھائی دی جو خالی تھی۔

”یہ ضیغ کی گاڑی ہے۔“ دردانہ نے آہستہ سے کہا۔

”مارو گولی..... تم آگے چلتی رہو۔“ حمید شانوں کو جنبش دے کر بولا۔

کچھ دور چل کر اچانک وہ پھر رک گئی اور مرکز حمید سے بولی۔ ”بھڑیا۔“

”کہاں.....!“

”مرچکا.....!“

”اوہو..... اسے مارا کس نے۔ میری گن کے چہرے اس کے پاؤں میں لگے ہوں

گے لیکن یہ بڑی گولی۔“

”ہو سکتا ہے ضیغ ہی نے اسے ختم کر دیا ہو۔ ایک اجنبی بھی تو ساتھ ہے اس کے۔ ہو سکتا

ہے اس نے بوڑھے صمدانی پر حملہ کیا ہو۔“

”اسے بوڑھا صمدانی نہ کہو..... جو ان صمدانی کہو..... بہت تا کتور ہے۔“

”ہونہہ..... چلو آگے بڑھو..... اب تمہیں آگے چلنا چاہئے۔ میں پیچھے سے روشنی

دکھاؤں گی۔“

کچھ ہی زینے طے کئے تھے کہ داہنی جانب والے ایک دریتچے میں روشنی دکھائی دی  
دردانہ نے حمید کا شانہ دبا کر رک جانے کا اشارہ کیا۔ جن زینے پر وہ کھڑے ہوئے

”اوہو! اوہو!.....!“ دونوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔

”اے کھولے..... اے کھولے۔“ ضیغم نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”نہیں.....!“ صدائی کا لہجہ بے حد سخت تھا۔ ”اب تم دونوں کو اس سے کوئی سروکار نہ

ہونا چاہئے۔“

”یہ..... یہ..... تو زیادتی ہے صدائی بھائی۔“ قاہر گھگھکیا۔

”جی ہاں..... جناب۔“ ضیغم کا پتتی ہوئی آواز میں بولا۔

ٹھیک اسی وقت چھت کی تاریکی سے ایک سیاہ فام آدمی صدائی پر آ کودا اور اس کے

ہاتھ سے صندوقچی چھینتا ہوا دور جا کھڑا ہوا۔

حمید نے طویل سانس لی۔ یہ چوتھا آدمی سر تاپا سیاہ پوش تھا۔ لباس کھال کی طرح

پورے جسم پر منڈھا ہوا تھا۔ صرف آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے اور چمکدار آنکھیں ان سے

صاف نظر آ رہی تھیں۔

”صندوقچی زمین پر ڈال دو.....!“ صدائی نے گرج کر کہا۔

”بکواس مت کرو..... ورنہ ہڈیاں تو زردوں گا۔“ سیاہ پوش بولا۔ حمید کی جان میں مزید

جان آئی۔ آواز فریدی ہی کی تھی۔

صدائی نے فائر کر دیا۔

”بس.....!“ سیاہ پوش نے قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد صدائی نے بقیہ پانچ کارتوس بھی

پوش سے لپٹ پڑا تھا۔ صندوقچی اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ لیکن ان دونوں میں اتنی جرأت

اچانک قاہر اور ضیغم ”بھوت بھوت“ چیختے ہوئے اس دریتچے کی طرف بھاگے جس کی

دوسری طرف حمید اور دردانہ کھڑے تھے۔

حمید نے مکے مار مار کر ان دونوں کو پھر کمرے کے وسط میں پہنچا دیا۔ ادھر صدائی سیاہ

پوش سے لپٹ پڑا تھا۔ صندوقچی اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ لیکن ان دونوں میں اتنی جرأت

دفعۃ صدائی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ٹھہر جاؤ.....!“ اور قاہر کے ہاتھ سے موم بتی لے کر نہیں تھی کہ اسے اٹھا لیتے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے بُری طرح کانپ رہے

گڑھے کے قریب لایا..... اس کے بعد اس نے داہنا ہاتھ گڑھے میں ڈالا تھا اور ایک تھوڑے اور ان کی خوفزدہ چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

اس نے ان تینوں کو دیکھا جو ایک موم بتی کی روشنی میں بڑے غور سے سامنے والی دیوار

کا جائزہ لے رہے تھے۔ دردانہ اس کی پشت پر لدی ہوئی کمرے میں جھانک رہی تھی۔

”کیا مصیبت ہے۔“ دفعۃ صدائی کی آواز آئی۔ ”ابھی تک ہم بھیڑیا ہی نہیں تلاش کر سکے۔“

حمید نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ دیوار پر بنے ہوئے ایک پیٹرن کا جائزہ

رہے ہیں۔ یہ فرش سے دو فٹ کی اونچائی تک دیوار پر چاروں طرف بنا ہوا تھا۔ مختلف

جانوروں کی تصویریں اس طرح ترتیب دی گئی تھیں کہ گل بوٹے سے معلوم ہوتے تھے۔

”اوہو..... یہ رہا..... پھر سے دیکھ لو..... پورے پیٹرن میں اس بھیڑیے کے علاوہ

کوئی دوسرا بھیڑیا موجود نہیں۔“ صدائی نے ان دونوں کو مخاطب کر کے کہا اور وہ دونوں بار

بیٹے ایک بار پھر چاروں طرف گھوم کر اس کے بیان کی تصدیق کرا آئے۔

”کوئی دوسرا نہیں ہے۔“ سردار قاہر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”اچھا تو پھر کام شروع کر دو.....!“ صدائی نے ضیغم کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے

پیارے کہا۔

حمید گرم گرم سانسیں اپنے بائیں گال پر محسوس کر رہا تھا اور اب اسے قطعاً دلچسپی نہیں رہی تھی کہ کمرے کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ بس وہ ایک غیر جانبدار تماشا کی طرح سب کچھ

دیکھے جا رہا تھا۔

ضیغم نے چرمی تھیلے سے کچھ اوزار نکالے اور بھیڑیے کی تصویر پر سے پلاسٹر ادھڑا

شروع کر دیا۔ ذرا ہی دیر میں اس نے دیوار میں خاصا بڑا گڑھا بنادیا تھا۔

دفعۃ صدائی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ٹھہر جاؤ.....!“ اور قاہر کے ہاتھ سے موم بتی لے کر نہیں تھی کہ اسے اٹھا لیتے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے بُری طرح کانپ رہے

گڑھے کے قریب لایا..... اس کے بعد اس نے داہنا ہاتھ گڑھے میں ڈالا تھا اور ایک تھوڑے اور ان کی خوفزدہ چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

حمید بھی کمرے میں کود جاتا لیکن دردانہ نے اس کی کمر تھام لی۔

”یہ کیا کر رہی ہو۔“ حمید بھنا کر بولا۔

”میں تمہیں اندر نہیں جانے دوں گی۔ تم نے دیکھا نہیں کہ چھ گولیاں کھانے کے

بھی وہ صمدانی سے چمٹا ہوا ہے۔“

”میرا بڑا بھائی ہے..... مجھے جانے دو۔“ حمید نے کہا اور ناک سے اسپرنگ نکال

جیب میں ڈال لئے۔

اس کے بعد وہ دردانہ سمیت کمرے میں کود گیا تھا۔ وہ اسے برا بھلا ہی کہتی رہ گئی تھی

”پرنس.....؟“ صمدانی پُرمسرت لہجے میں چیخا۔ ”میری مدد کرو۔“

”میں بھوتوں سے چہل نہیں کرتا۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا اور صندوقچی فرش سے اٹھا

”اچھا..... اسے لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔“

”نہیں..... تمہاری کشتی میں مزا آ رہا ہے۔ میں یہیں رک کر تماشا دیکھنا چاہتا ہوں۔

دردانہ دونوں کے قریب جا کھڑی ہوئی تھی۔

”بھٹھ..... بھاگو بیٹی..... بھوت.....!“ قاہر کا نپٹا ہوا چیخا۔ ”پرنس بھاگو..... مم۔

مجھے بھی نکال لے چلو۔“

”بھوت ہی..... معلوم ہوتا ہے۔“ صمدانی سیاہ پوش سے گٹھا ہوا بڑبڑایا۔ ”پتھر کا ہے پتھر

اور پھر اس پتھر پہ بھوت نے صمدانی کو سر سے اونچا اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔

صمدانی کی چیخ بڑی کرب ناک تھی۔ اس کے بعد وہ نہیں اٹھ سکا تھا۔

”برادر م بھوت..... کیا یہ مر گیا۔“ حمید نے سیاہ پوش سے پوچھا۔

”پتہ نہیں..... خود دیکھ لو۔“ اس نے جواب میں کہا اور حمید کے ہاتھ سے صند

چھین کر درتچے سے باہر چھلانگ لگادی۔

عجیب سا سناٹا کمرے کی فضا پر مسلط تھا۔ بھوت کی رواں لگی کے بعد ہی دونوں باپ

ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے اور خاموش کھڑے گہری گہری سانس لے رہے تھے۔

حمید صمدانی پر جھکا ہوا تھا۔ وہ بیہوش تھا۔ شاید داہنے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

داہنا ہاتھ تیزی سے متورم ہوتا جا رہا تھا۔

جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو قاہر نے پوچھا۔ ”کک کیا..... مر گئے صمدانی بھائی۔“

”بیہوش ہو گیا ہے..... بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔“

”ہمیں یہاں سے نکال لے چلے پرنس! جتنی جلدی ممکن ہو۔“ قاہر نے بڑی لجاجت

سے کہا۔

اچانک ضعیف چونک کر بولا۔ ”مم..... میرا بھیڑیا۔“

”تمہارا بھیڑیا..... تم نے تو اسے گولی ماری تھی۔“

”نن..... نہیں.....!“ ضعیف بوکھلا کر بولا۔

”ہم نے راستے میں اس کی لاش دیکھی تھی۔“ دردانہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مجھے

نفرت ہو گئی ہے تم سے۔“

”ہم دونوں کو معاف کر دو بیٹی۔“ قاہر نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”مجھے بتائیے یہ..... یہ سب کیا ہے۔“

”یہ ہماری کمینگی کی کہانی ہے بیٹی۔ گھر چلو..... میں سب کچھ بتا دوں گا۔“

اتنے میں ضعیف ”میرا بھیڑیا..... میرا بھیڑیا“ چیخا ہوا درتچے کی طرف چھٹا اور باہر کود گیا۔

”اوہ..... جہنم میں جائے بھیڑیا۔“ قاہر بڑبڑایا۔ ”پرنس خدا کے لئے یہاں سے

چلو..... وہ صندوقچی تمہارے باپ کی ملکیت تھی۔“

”کیا مطلب.....؟“ دردانہ چونک پڑی۔

”گھر چلو..... وہیں سب بتاؤں گا۔“

اتنے میں کئی لوگ درتچے سے اندر کود آئے۔ ان کے جسموں پر ریاستی پولیس کی

وردیاں تھیں۔

”اوہو..... ولی خان۔“ قاہر ایک آدمی کی طرف ہاتھ اٹھا کر چکا۔

”میں خان کے حکم سے آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔“ اس نے ہتھکڑیاں نکالتے ہوئے کہا۔

”کک..... کیوں.....“ خان..... تو بول بھی نہیں سکتے۔“

”بھگدہ اس وقت کو تو ابلی میں تشریف رکھتے ہیں اور سردار ضعیف کو درخواست کر کے

پولیس کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“



کا باپ مرتے وقت آدھا نقشہ اپنے بیٹے قاہر کے سپرد کرتے ہوئے وصیت کر گیا کہ وہ صمدانی سے دوسرا نصف حاصل کر کے پورا نقشہ اقتدار الدولہ تک پہنچا دے لیکن قاہر کی نیت بھی بدل گئی۔ اب قاہر اور صمدانی میں ٹھن گئی۔ ادھر قاہر جو خان ظفر یاب کا سالا بھی تھا اس کوشش میں لگ گیا کہ دردانہ کی شادی اقتدار الدولہ کے بیٹے کی بجائے اس کے بیٹے ضیغم سے ہو۔ آخر اس نے خان ظفر یاب کو قید کر کے یہ بات مشہور کرادی کہ وہ سخت بیمار ہیں۔ گھر والوں تک کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ادھر ضیغم نے باؤلی میں ایک بھیڑیا پالا کیونکہ ان کے پاس والے آدھے نقشے سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ جو کچھ بھی ہے باؤلی ہی میں ہے۔ یہ بھیڑیا اس لئے پالا گیا تھا کہ صمدانی اور اس کے خواری ان کی لاعلمی میں باؤلی میں داخل نہ ہو سکیں۔ ادھر قاہر کے باپ کا پیغام ملتے ہی اقتدار الدولہ نے صمدانی سے آدھے نقشے کا مطالبہ کیا۔ صمدانی نے اس سے لاعلمی ظاہر کی۔ پھر بات اتنی بڑھی کہ وہ اقتدار الدولہ کی ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔ ابھی حال ہی میں جب یہ بات میرے علم میں آئی تو میں نے سپرنٹنڈنٹ کو یہی مشورہ دیا جس پر تم عمل کر چکے ہو۔ اقتدار الدولہ نے صمدانی سے استدعا کی کہ وہ ان کے بیٹے کے لئے وہی روایتی فریضہ ادا کرے جو خود ان کے لئے ان کے باپ نے ادا کیا تھا۔ صمدانی کو منہ مانگی مراد ملی۔ اس طرح وہ خان دوراں کے قلعے میں بہ آسانی داخل ہو سکتا۔ لیکن اگر اسے اس کا علم ہوتا کہ قاہر پوری طرح قلعے پر تسلط جما چکا ہے تو شاید وہ ادھر کا رخ بھی نہ کرتا۔ میں خود بھی یہی سمجھتا تھا کہ خان ظفر یاب بہت زیادہ بیمار ہیں۔ اگر ہم اس طرح وہاں نہ پہنچتے تو ان کی رہائی ناممکن ہوتی اور وہ سوتھہ پا کر انہیں اس طرح ختم کر دیتے کہ طویل علالت کے بعد قدرتی موت کا گمان ہوتا۔ میں ان حالات سے اس لئے لاعلم رکھا گیا تھا کہ مختلف مواقع پر تمہاری حیرت صداقت پر مبنی ہو۔ ایکٹنگ نہ معلوم ہو۔ صمدانی بے حد چالاک ہے۔“

تقریر ختم ہو گئی اور حمید نے ریکارڈر کو آف کر کے سر کھجنا شروع کر دیا۔ طرح طرح کے منہ بن رہے تھے۔ لیکن بے بی خان..... اس نے بھنڈی سانس لی اور اٹھ کر باتھ روم کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کیس کے دوران وہ یہی تو کرتا رہا تھا۔

تمام شد